بہشت

بشریٰ رحمٰن

انتساب

ان بیٹوں

کے نام

جو ماؤں سے دور

پردیس میں جا بستے ہیں

ہر اینٹ تو دیوارِ حرم کے نہیں لائق
ہر وضع کے پتھر کو صنم کہہ نہیں سکتے
چہروں پہ بھی کب ابھری ہیں اندر کی کتابیں
جو درد کہ تھا دل پہ رقم، کہہ نہیں سکتے

''سید ضمیر جعفری''

اس کتاب میں

بہشت (ناولٹ) ۹

بیگم صاحبہ (ناولٹ) ۵۹

ممتا (افسانہ) ۱۰۷

امڑی (افسانہ) ۱۳۷

بددعا (افسانہ) ۱۵۳

بہشت

(ناولٹ)

کچھ یاد نہیں۔

مجھے اپنی ماں سے نفرت کب ہوئی---؟

غالباً میں اس وقت تیرہ برس کا تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں ہر وقت کسی نہ کسی ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا تھا۔ میری کلاس کے بچے جو بڑے کھاتے پیتے گھرانوں سے آتے تھے۔ نت نئی چیزیں سکول لایا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک بچہ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں اپنے والدین کے ہمراہ امریکہ جایا کرتا تھا اور واپسی پر بہت سی کتابیں اور رسائل اپنے ساتھ لایا کرتا تھا۔ پھر سارا سال وہ کتابیں اور رسائل ہماری کلاس میں گردش کرتے تھے۔ یوں تو میں اپنی کلاس کا بڑا چپ چاپ اور روٹھا ہوا بچہ تھا۔ ہر ایک سے خفا۔ ہر ایک سے الگ---مگر کسی طرح یہ کتابیں اور رسالے مجھ تک بھی آ پہنچتے۔

میری ماں کی بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ میرے کمرے میں بے وقت اور اچانک آتی تھی۔

یوں دیکھنے میں اس نے مجھے ایک بہت ہی خوب صورت کمرہ دے رکھا تھا جس میں زندگی کی ساری آسائشیں تھیں مگر مجھے کبھی کبھی اس کمرے میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

عین اس وقت جب ساری دنیا خواب خوشگوار کے مزے لوٹتی۔ گھر میں سناٹا چھا جاتا۔

قدموں کی آہٹیں سو جاتیں۔ اور ماں مجھے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ تو پھر میں سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنے دوست کی عنایت کردہ کتاب نکالتا اور ورق گردانی شروع کر دیتا۔ گو ایسی کتابیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر مجھے انہیں پڑھنے میں بہت مزہ آتا تھا۔

جب میں استغراق کی ندی میں کندھوں تک ڈوب جاتا تو جانے کس وقت میری ماں میرے کمرے میں آ جاتی اور میرے سر پر کر کھڑی ہو جاتی۔ میں جو خوف زدہ سا اس کی طرف دیکھتا تو وہ بڑے رسان سے مسکرا دیتی۔ اور ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ سے کتاب لے لیتی۔ اس وقت میرے دل میں بھونچال آ جاتا اور جسم کا سارا لہو ابلنے لگتا۔ میں خوف کے مارے دم سادھ نا کہ بس ابھی پھٹکار پڑی کہ پڑی---

مگر میری ماں چپ چاپ کتاب کی ورق گردانی کرتی رہتی۔ میں اپنے آپ کو اس قسم کے سکہ بند فقرے سننے کے لیے تیار کرتا رہتا۔

"شرم کرو۔ یہ کتابیں تمہارے پڑھنے کی ہیں---"

"ذلیل کتے! تو ایسی کتابیں پڑھتا ہے---؟ کیا میں نے تمہاری ایسی ہی تربیت کی ہے؟"

یا---

"خبردار، جو پھر اس قسم کی واہیات اور فضول کتابیں پڑھنے کی کوشش کی، میں تمہاری جان نکال لوں گی۔"

جس طرح دوسرے بچوں کی مائیں آئے دن انہیں دھمکاتی اور مارتی رہتی تھیں اور بچے سکول میں آ کر طرح طرح کی باتیں بتایا کرتے تھے۔

میری ماں بڑی سکون سے کتاب کی ورق گردانی کر کے اسے بند کر دیتی۔ اور پھر ہاتھ

بڑھا کے یہی کتاب میرے ہی سرہانے کے نیچے رکھ دیتی۔ اور بڑی محبت سے کہتی۔

"اچھو کے بچے! صبح سکول جانا ہے کہ نہیں۔ بارہ بج گئے اور ابھی تک پڑھ رہے ہو اور اگر صبح تمہاری آنکھ نہ کھلی تو میں چیخوں گی، چلاؤں گی اور تمہیں برا لگے گا۔"

پھر اپنے لہجے کو اور بھی میٹھا بنا لیتی اور ہنس کر کہتی:

"صبح صبح چلانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بیٹا! اگر میں اپنی صبح چیخنے اور چلانے سے شروع کروں تو سارا دن ہی بہت بھاری لگتا ہے اور پھر سارا دن مجھے یہی قلق ہوتا رہتا ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو ڈانٹ کر سکول بھیجا تھا۔ کوئی ماں اپنے بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کے سکول نہیں بھیجنا چاہتی۔"

یہ کہہ کر وہ جھک کے میری پیشانی چوم لیتی اور پھر کہتی۔

"جس صبح چھٹی ہو اس رات خوب کتابیں پڑھا کرو۔ چاہے ساری رات جاگ لیا کرو، میں کچھ بھی نہ کہوں گی۔"

وہ میرے کمرے کی بتی بجھا دیتی، پردے برابر کر دیتی۔ میری پیشانی سے بال ہٹا کے پھر مجھے ایک بوسہ دیتی اور شب بخیر کہہ کے باہر نکل جاتی۔ میں بڑی مری ہوئی آواز میں اسے شب بخیر کہتا۔

مگر دل ہی دل میں کھولتا رہتا کہ ماں باہر نکلے تو میں بتی جلا کر دوبارہ کتاب پڑھنا شروع کر دوں۔

پر نہ جانے کیا ہوتا کہ میں باوجود کوشش کے اپنے تکیے کے نیچے سے وہ کتاب نہ نکال سکتا جو میری ماں اس کے نیچے رکھ کر نکل جاتی۔ نہ ہاتھ بڑھا کر بتی جلا سکتا۔ بس جلتا کڑھتا سو جاتا۔

دوپہر کو جب سکول سے واپس آ کر جلدی سے تکیہ ہٹا کر دیکھتا تو وہ کتاب جوں کی توں

تکیے کے نیچے رکھی ہوتی۔ تب میں سوچتا۔ میں پاگل ہوں یا میری ماں بیوقوف ہے۔

لیکن سارا دن مجھے بات بات پر غصہ آتا رہتا۔ پتہ نہیں اپنی ماں پر آتا کہ اپنے آپ پر' آخر اسے معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک قابل اعتراض کتاب اپنے سرہانے کے نیچے رکھتا ہوں۔ اور ایسی کتابیں پڑھنے کی میری عمر نہیں۔ میرا احساس جرم کہتا کہ ماں کو یہ کتاب یہاں سے غائب کر دینی چاہئے تھی۔ مگر اندر کا باغی لڑکا کھولتا کہ آخر ماں کو کیا حق ہے مجھ سے میری آزادی چھیننے کا۔

اچھا ہے یہ کتاب میرے تکیے کے نیچے اسی طرح پڑی رہے۔

کتاب وہاں پڑی رہتی مگر میں ڈر کے مارے اسے ہاتھ نہ لگا سکتا۔ ایسے لگتا اسے چھوؤں گا تو وہ انگارہ بن جائے گی۔ سارے لفظ ماں کے چہرے میں ڈھل جاتے اور میرا جی چاہتا کہ ایک دن کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں پھوڑ لوں۔

پھر اگلے دن یوں ہوتا کہ میری میز پر بے شمار کتابیں آ جاتیں۔

بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں۔

سائنس کی نئی ایجادات۔

اسلامی نظریات۔

حب الوطنی کے جذبوں سے لبریز کہانیاں۔

قہقہوں سے بھرپور طنز و مزاح کی کتابیں۔

اچھے شعری مجموعے۔

انہیں دیکھتے ہی ماں کی سازش کھل کر میرے سامنے آ جاتی۔ اور میں کہتا کہ میں ان کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ در پردہ ماں مجھے یہ بتانا چاہتی ہے کہ میں گندی کتابیں پڑھتا ہوں۔ میرے پڑھنے کے لائق کتابیں صرف وہ ہی خرید کر لا سکتی ہے۔ دن میں کتابوں

کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ پھر ایک دن ماں رات کو شب بخیر کہنے کے بہانے آتی اور کہتی۔

''افوہ! مجھے تمہیں بتانا یاد ہی نہ رہا۔ اس روز میں بازار گئی تھی۔ تمہارے لیے کتابیں لائی ہوں۔۔ شاید تمہیں پسند نہیں آئیں۔ ہے نا؟''

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر انہیں اٹھا کر سامنے بک شیلف میں سجا دیتی اور کہتی۔

''یہاں پڑی رہنے دو۔ میں اٹھا اٹھا کر پڑھتی رہوں گی۔ بیٹا مجھے معلوم نہیں۔ کس قسم کی کتابیں پسند کرتے ہو۔ کسی روز مجھ سے پیسے لے جانا اور اپنی پسند کی کتابیں لے آنا۔''

اب بات صرف اتنی سی تھی۔ کہ وہ مجھے ڈانٹ دیتی کہ فلاں کتاب تمہارے پڑھنے کے لائق نہیں ہے۔ تو اتنی لمبی تمہید کبھی ضائع نہ ہوتی۔ یا میرے تکیے کے نیچے سے کتاب اٹھا کے اسے جلا دیتی مگر وہ ایسا کچھ نہیں کرتی تھی۔

ایک دن میں خود ہی اس کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نالی میں بہا دیتا۔ چپ چاپ ماں کی لائی ہوئی کتابیں نکال نکال کر پڑھنے لگتا۔ تب مجھے احساس ہوتا کہ سب کتابیں میرے ہی پڑھنے کی تھیں۔ بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں پڑھ کے میرے اندر جوش و خروش کے جذبات پیدا ہوتے۔

رفتہ رفتہ میں ماں کی لائی ہوئی کتابوں کا اس طرح عادی ہو گیا۔۔ جس طرح نوعمر لوگ چرس کے عادی ہو جاتے ہیں۔

میری ماں نصیحتیں نہیں کرتی تھی۔۔ بس صرف باتیں کیا کرتی تھیں۔ اس کی باتوں کا مرکز میں نہیں ہوتا تھا۔۔ بس وہ دنیا جہان کی باتیں کرتی۔ وہ کبھی اپنے تجربے بیان نہیں کرتی تھی۔ اپنے ذاتی تجربے بیان کرنے والے بزرگوں کو نئی نسل کے بچے پسند نہیں کرتے۔

میری ماں پھٹکارتی بھی نہیں تھی۔ اکثر حرکتیں اسے غصہ دلانے کے لیے کرتا تھا۔ مگر

ایسے لگتا میری ماں کی مٹی میں غصے کا خمیر نہیں ہے۔ وہ غصے کو یوں پی جاتی جیسے یہ آبِ حیات ہو اور پھر چپکے چپکے ایسی باتیں کرنے لگتی جو چرس کی طرح افیون کی طرح لگتی جاتیں اور چڑھتی جاتی تھیں۔

شاید ماں کی انہی باتوں نے رفتہ رفتہ مجھے ماں سے متنفر کر دیا۔ یا ذہنی طور پر دور کر دیا۔

یہ ضرور ہے کہ میری ماں میری بڑی اچھی کفالت کر رہی تھی، بلکہ جب سے ڈیڈی فوت ہوئے تھے، وہ سروس کر رہی تھی۔ میری ماں نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔

"دیکھو، میں تمہارے ناز اٹھانے کے لیے ملازمت کرتی ہوں۔"

بلکہ اگر کوئی اس کی قریبی رشتہ دار یا عزیز سہیلی آ کر بڑی ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

"صابرہ! تو کتنی جفاکشی کر رہی ہے کہ اس ایک بچے کی خاطر دنیا کی خوشیوں سے منہ موڑ رکھا ہے۔ طرح طرح کے کام کر کے اس کی ہر خواہش پوری کرتی ہے۔ پتہ نہیں یہ بچہ بڑا ہو کے تیرا بنے گا یا نہیں۔"

تو میری ماں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ وہ طیش سے یوں بل کھاتی جیسے اس کے پاؤں پر بچھو نے کاٹ لیا ہو اور اپنا غصہ نتھنوں میں دبا کر کہتی۔

"میں کسی پر احسان نہیں کر رہی۔ نہ اپنے بیٹے کے لیے کرتی ہوں۔ میرے بیٹے کے لیے میرا شوہر بہت کچھ چھوڑ گیا ہے۔ میں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کے بے مقصد زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ میں بھرپور زندگی کی قائل ہوں۔ اپنی زندگی آپ جینا چاہتی ہوں۔" اس وقت میں گھڑی بھر کو اپنی ماں کی طرف دیکھتا تو جیسے سارا زمانہ اس کی آنکھوں میں ٹھہر جاتا۔ مجھے ماں بہت بڑی بہت مضبوط اور بہت اونچی دکھائی دیتی۔ مضبوط مائیں کمزور بچوں کو بری لگتی ہیں۔

میں بیک وقت دو قسم کے احساسات سے دوچار ہو جاتا۔ "میری ماں کتنی عظیم ہے کہ

مجھے پال رہی ہے۔ ‘‘

’’یا میری ماں مجھ پر احسان کر کے مجھے خریدنا چاہ رہی ہے۔ ‘‘

اولاد ماں باپ کو کسی بھی جذبے کے عوض خرید لیتی ہے۔ لیکن ماں باپ اولاد کو کبھی نہیں خرید سکتے۔

یہ انمول دولت ہر وقت اپنی قیمت چکاتی رہتی ہے۔

جب کبھی میں اپنی ماں کے صبیح چہرے پر تھکن کی گھٹائیں دیکھتا۔ یا اسے کبھی کراہتے ہوئے سن لیتا۔ تو اس کے پاس جا بیٹھتا اور چاہتا کہ اس کی ڈھارس بندھواؤں۔ اس سے ہمدردی جتاؤں۔ محبت بھرے لہجے میں اس سے کہوں۔

’’ماں تو کتنا تھک جاتی ہے۔ کس قدر کام کرتی ہے۔ کیوں اپنا آپ ہلکان کرتی ہے؟ ‘‘

ابھی میں کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ کہ ماں اپنی ساری تھکاوٹ اور مردہ دلی کا لبادہ چاک کر کے مسکرا پڑتی۔ اور ایک دم کہتی۔

’’کیا بات ہے اچھو! آج تم بہت چپ چپ اور تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔۔۔ ‘‘

مجھے اسی وقت اپنی ماں پر غصہ آنے لگتا۔ میرا فقرہ مجھ سے چھین کر ماں بہادر بننے کی کوشش کرتی۔ حالانکہ جس ماں کا ایک بیٹا ہو۔ اسے خود بہادر بننے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک دن میں نے کھانا اس لیے نہیں کھایا کہ سالن میں نوکرانی نے سبز دھنیا ڈال دیا تھا۔ اور سبز دھنیا مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں منہ پھلائے بیٹھا تھا کہ میری ماں آ گئی۔

میں نے زور سے پلیٹ دور پھینکی اور اسے صاف بتا دیا کہ میں دھنیے والا سالن ہرگز نہیں کھاؤں گا۔

پہلے تو ماں نے مائی کو بلا کر خوب ڈانٹا اور اسے سمجھا دیا کہ آج کے بعد کسی سالن میں

بھی سبز دھنیا نہ ڈالا کرے--- پھر صاف پلیٹ لے کر میرے پاس آ بیٹھی اور کہنے لگی-

''اگر تم کہو تو ابھی دوسرا سالن بنا کے لا دوں- ورنہ دھنیے کی پتیاں چن کے نکال دیتی ہوں- اور اسی سالن کے ساتھ تم روٹی کھا لو-''

وہ پتیاں چن چن کے ایک پلیٹ میں الگ رکھتی رہی' دھیرے دھیرے اپنی عادت کے مطابق باتیں بھی کرتی رہی-

''اللہ کی نعمتوں کو اس طرح نہیں ٹھکراتے- کھانا اچھا نہ بھی لگے تو صبر وشکر سے کھا لینا چاہیے- پلیٹیں اٹھا اٹھا کر دور پھینکنے سے انسانی فطرت کا گھٹیا پن نمایاں ہوتا ہے- کھانے کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کرنا چاہیے- اللہ کو کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ یہ برتاؤ پسند نہیں ہے-

ابھی سے تمہارا مزاج اتنا بگڑا ہوا ہے- کہ سالن اپنی مرضی کے خلاف ہو گیا تو تم نے پلیٹیں اٹھا اٹھا کے پھینکنا شروع کر دیں--- میرے بچے--- یہ دنیا تو بڑی ظالم اور سفاک ہے-- جب تم باہر نکلو گے تو تمہیں علم ہو گا- کہ یہاں ہر بات اپنی مرضی کے خلاف ہوتی ہے- مگر دل پر جبر کرنا پڑتا ہے- ساری دنیا کا رویہ اپنی ماں جیسا نہیں ہوتا اور ساری دنیا کے منہ پر پلیٹیں اٹھا کے نہیں ماری جا سکتیں- اپنے اوپر ضبط کرنا سیکھو--- مرضی کے خلاف کچھ ہو جائے تو اسے قبول کرنا سیکھو-

اور تم تو اتنے سمجھدار بچے ہو-

میرے چاند! پتہ نہیں تم نے دنیا میں کتنے بڑے بڑے کام کرنے ہیں- خدا جانے خدائی کے لیے کیا کیا کرو گے- بڑے بڑے کام کرنے والے بچے اپنی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں نہیں بنایا کرتے- کتنی معمولی بات کو اپنے مزاج پر چڑھا رہے ہو- دھنیا--- کتنی چھوٹی سی چیز ہے- اس کے آگے اپنے آپ کو بے بس بنائے بیٹھے ہو- حالانکہ کل تم نے بڑے بڑے فیصلے کرنے ہیں- مرد کو پسند اور ناپسند سے بالاتر ہو جانا چاہیے- نخرے کرنا تو

عورتوں کا کام ہے- مرد نخرے نہیں کرتا، فیصلہ کرتا ہے، فیصلہ کرتا ہے اور کر کے دکھاتا ہے- مجھے بڑی خوشی ہوتی، اگر تم فیصلہ کر لیتے کہ باوجود اس کے دھنیا تمہیں پسند نہیں- تم آج اسے کھا کر دکھاؤ گے- اپنے نفس کی نفی کرنا، اور اپنی بری عادتوں کو شکست دینا ہی سب سے بڑی مردانگی ہے-

میرے بچے! ننھی ننھی باتوں پر جی نہ جلایا کرو، کڑھا نہ کرو- کل تمہیں بہت محنت کرنا ہے، جب تمہارے کندھوں پر بڑے بڑے بوجھ ہوں گے اف---!''

اور ماں دھیرے دھیرے اپنی عادت کے مطابق باتیں کرتی رہی-- بس مجھے ہوش تب آیا جب میں سارا کھانا ختم کر چکا تھا- میں نے ماں کی باتوں کی پروا نہیں کی تھی کہ میں سالن میں دھنیا بھی کھاتا جا رہا ہوں-

جب کھانا ختم کر چکا---تو میری ماں کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا- بڑھ کر اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگی-

''شاباش! تم جیسے بچے پر مجھے فخر ہے-''

لیکن میں رات بھر کڑھتا رہا- آخر میں دھنیے والا سالن کیوں کھا گیا- ماں نے مجھے مجبور تو نہیں کیا تھا- وہ تو بس آہستہ آہستہ مجھے الفاظ کی تھپکیاں دیتی رہی تھی-

اور اس کے الفاظ کی یہی تھپکیاں مجھے زندگی بھر بری لگتی رہیں-

جب میں دسویں جماعت میں پہنچا تو میری فطرت کا ضدی پن سکول میں بھی عیاں ہونے لگا- یہ عمر عجیب ہوتی ہے- یا تو ساری دنیا سے چھپ کے رہنے کو جی چاہتا ہے یا دل کرتا ہے- جنگلی بھینسے کی طرح ہر ایک کے سر میں سینگ پھنسا دیں- مجھ پر ہمہ وقت سینگ پھنسانے والی کیفیت طاری رہتی تھی- نتیجتاً ایک دن میں انگریزی کے استاد سے الجھ بیٹھا- اور یوں سکول میں میرے برے دن شروع ہو گئے-

اس بات میں بھی میں سراسر ماں کو قصوروار سمجھتا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے صداقت اور دیانت کا رونا رہتی تھی اور کہتی تھی جہاں کہیں بے انصافی دیکھو اس کے خلاف آواز ضرور اٹھاؤ۔

ہمارے انگریزی کے استاد قدیر صاحب تھے اور ہماری کلاس کے کچھ لڑکے انہی قدیر صاحب سے رات کو ٹیوشن پڑھا کرتے تھے۔ اب قدیر صاحب کا طریقہ یہ رہا کہ جو لڑکے ان کے گھر ٹیوشن پڑھنے جاتے انہیں ایک روز پہلے پرچہ یاد کرا دیتے بعد میں وہی لڑکے اعلیٰ ترین نمبر لے کر کامیاب ہو جاتے۔ اور میں جو اپنی کلاس کا مانا ہوا لائق فائق طالب علم تھا۔ درجہ دوم میں آ جاتا۔ ایک دن میں نے ان لڑکوں کا گریبان پکڑ کے انہیں چیلنج کر دیا اور انہوں نے میری شکایت قدیر صاحب سے کر دی۔ بس میں وقت بے وقت ان کے عتاب کا نشانہ بننے لگا۔ وہ مجھے روزانہ کلاس سے باہر نکال دیتے۔ پرنسپل سے میری شکایت کرتے۔ کسی نہ کسی بات پر مجھے جرمانہ لگ جاتا۔

کلاس میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک میری حمایت میں اور دوسری میری مخالف میں--- اور پھر میں سکول میں خوامخواہ بدنام ہونے لگا۔

ایک روز میں نے ساری صورت حال ماں کے آگے رکھ دی اور اسے سمجھایا۔

"اس طرح میری تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ میں میٹرک پاس نہ کر سکوں گا۔ میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہتا اور میں یکسوئی سے مطالعہ نہیں کر سکتا۔"

ماں نے اول سے لے کر آخر تک میری بات غور سے سنی۔ میرا خیال تھا۔ عام ماؤں کی طرح وہ ایک دم جذباتی ہو جائے گی۔ پہلے تو قدیر صاحب کو غائبانہ بہت کچھ سنائے گی۔ پھر سیدھی پرنسپل صاحب کے پاس جا کر ایک ایک کی دو دو لگائے گی۔ اس طرح میں قدیر صاحب کو سکول سے نکلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اور اگر ماں یہ سب نہیں کرے گی۔ تو مجھے سکول سے نکال لے گی۔ اور میں ہر روز تضحیک کا نشانہ بننے سے بچ جاؤں گا۔

میری ساری شکایات اور تکلیفیں ٹھنڈے دل سے سننے کے بعد ماں نے آرام سے پوچھا۔

''تم کیا چاہتے ہو اچھو۔۔۔؟''

میں نے جلدی سے کہا۔

''ماں! میرا اسکول بدل دو۔ بس آسان علاج تو یہی ہے۔ اب اس سکول میں، میں نہیں پڑھ سکتا۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔ ورنہ میں کسی دن قدیر صاحب کا سر توڑ دوں گا۔''

ماں دھیرے سے مسکرائی، جیسے مسکرانا اس کی عادت تھی۔

میرے ماتھے پر پھیلے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوارا اور یوں باتیں کرنے لگی جیسے مجھے کہانی سنا رہی ہو۔

''اچھو! مجھے معلوم ہے تم جو کچھ کہہ رہے ہو۔ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم نے ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے اپنے استحقاق کی جنگ لڑی۔ اب دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں جا کر قدیر صاحب سے جھگڑا کروں اور پھر ان کی شکایت پرنسپل صاحب کے آگے کر دوں۔ اس سے جانتے ہو کیا ہو گا۔ سارے سکول میں بے سکونی کی ہوا چلنے لگے گی۔ خوامخواہ ایک سکینڈل بن جائے گا۔ پھر تم جانتے ہو آج کل ہر ایک کو اپنی نوکری پیاری ہوتی ہے۔ پرنسپل صاحب صرف ہماری شکایت پر کوئی ٹھوس اقدام نہیں کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے ایک استاد کے خلاف قدم اٹھانے پر سارا سٹاف ان کے خلاف کھڑا ہو جائے۔ ایسے عالم میں جو اساتذہ پرنسپل کے خلاف ہیں۔ انہیں اپنی من مانی کرنے کا موقع مل جائے گا اور ممکن ہے ہماری وجہ سے پرنسپل صاحب کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے میرے بچے! کہ پرنسپل صاحب ہماری کوئی بات ہی نہ سنیں یا پھر ہمیں یونہی جھوٹی تسلی دے کر ٹرخا دیں۔ ایسی صورت میں تمہاری قدر صاحب

کی نظر میں کیا عزت رہ جائے گی، بلکہ تمہارے ساتھ پہلے سے بھی بدتر سلوک کرنے لگیں گے اور فرض کرو کہ پرنسپل صاحب قدیر صاحب کو نکال بھی دیں تو تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ بیٹے! اک ذرا سی انا کے لیے تم ایک آدمی کو بے روزگار کرنا چاہتے ہو۔ ان کے بھی چھوٹے چھوٹے ہوں گے۔ بھلا اس بات میں ان بچوں کا کیا قصور ہے؟

میں نے زہر بھری نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ مجھے اپنی ماں سے اسی لیکچر کی امید تھی۔

اس نے میرے تیور نظر انداز کر دیئے اور کہنے لگی۔

’’اور دوسری صورت یہ ہے کہ میں فوراً تمہیں اس سکول سے نکال لوں۔۔۔؟‘‘

ماں کی یہ بات سن کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ صورت تو سب سے اچھی تھی۔ ماں تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولنا شروع کر دیا۔

’’سوچ رہی ہوں تمہیں کس سکول میں داخل کراؤں؟ تم جانتے ہو۔ آج کل داخلوں کا ملنا کس قدر مشکل ہے اور پھر مڈٹرم میں تو کوئی سکول میں داخلہ نہیں دیتا۔ وہ تو یہی سمجھیں گے کہ تم نکمے طالب علم ہو اس لیے سکول سے نکال دیئے گئے ہو جس میں پورے نو سال پڑھتے رہے۔ اور اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ تم نئے سکول میں جا کر نئے بچوں کے ساتھ نہ چل سکو۔ ہر سکول میں میٹرک کی تیاری کروانے کا مختلف اسلوب ہوتا ہے۔ نئے سکول میں نئے مسائل ہوں گے۔ ان کو حل کرو گے یا میٹرک کی تیاری کرو گے۔۔۔؟‘‘

’’اس کا مطلب ہے آپ چاہتی ہیں۔ میں اسی سکول میں یہ ذلت اٹھاتا رہوں؟‘‘ میں نے غصہ سے کہا۔

’’نہیں میرے بچے۔۔۔‘‘ ماں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

’’کوئی ماں اپنے بچے کو ذلیل نہیں کرنا چاہتی۔ میں وہی کروں گی جو تم چاہتے ہو۔

تمہاری خوشنودی مجھے عزیز ہے۔ فیصلہ تو بالآخر وہی ہو گا جو تم چاہو گے۔‘‘

ماں اٹھ کے ادھر ادھر کے کام کرنے لگی۔

میں اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ کیسی عجیب ماں ہے۔ مائیں بچوں کی ایسی باتیں سن کر جذباتی ہو جاتی ہیں اور جھٹ استادوں سے لڑنے جا پہنچتی ہیں۔ میری ماں کتنے سکون سے گھر کے کام کر رہی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

پھر میری یونیفارم کی قمیص اٹھا کر لے آئی اور میرے پاس بیٹھ کر بٹن ٹانکنے لگی۔

بٹن ٹانکتے ہوئے وہ حسب عادت مجھے بھی ٹانکے لگاتی جاتی۔

اچھو بیٹے! مرد کی ساری زندگی ایک چیلنج ہوتی ہے۔ مرد اپنی ساری زندگی اپنے کیریئر کے اکھاڑے میں گزار دیتا ہے۔ جب تک کوئی اسے پٹخے نہیں، وہ کسی کو پٹخنی دینے کے قابل نہیں ہوتا۔ جب کسی میدان میں اس کی پیٹھ لگتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ دشمن کو گرانے میں کیا مزہ ہے۔۔۔! جس نے مار نہیں کھائی اور جس نے پٹخنی نہیں کھائی، وہ تو اچھا کھلاڑی ہو نہیں سکتا۔ میں تو سمجھتی ہوں مرد کا کردار سکول سے ہی بننا شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تمہارے سامنے ایک چیلنج ہے۔ قدیر صاحب اور ان کے چیلے چاہتے ہیں کہ تم یہ سکول چھوڑ کر چلے جاؤ۔

ممکن ہے لڑکے تمہاری لیاقت سے خائف ہوں اور وہ تمہیں پڑھائی کے میدان میں نہ ہرا سکتے ہوں اور ممکن ہے قدیر صاحب ایک بزدل استاد ہوں اور تمہارے جیسے بہادر اور حق کے لیے لڑنے والے لڑکے کو اپنی کلاس میں نہ رکھنا چاہتے ہوں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے جیسے اور لڑکے بھی کلاس میں ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد وہ ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ تم بزدلی کا ایک فراری راستہ کھولنا چاہتے ہو تاکہ ہر جیالا بچہ قدیر صاحب سے ڈر کر بھاگ جائے۔ نوجوانی کا پہلا کارنامہ بزدلی کی روشنائی سے

رقم کرنا چاہتے ہو۔

آج جو بھی تم کرو گے۔ تمہاری زندگی کی کتاب کے صفحہ اول پر لکھا جائے گا۔ آج تم نے ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا۔ تو دوسروں کے لیے نیا راستہ نہ بنا سکو گے۔ اگر آج مشکلات سے ڈر کر بھاگ گئے تو زندگی بھر بھاگتے رہو گے۔

آج ایک قدیر صاحب سے ڈر گئے ہو۔ اس دنیا میں تو قدم قدم پر قدیر صاحب ہیں۔ کس کس سے بھاگتے رہو گے۔ اور ہر آدمی جو طبعاً بزدل ہو جائے۔ وہ زندگی کے کسی موڑ پر بہادر نہیں بن سکتا۔ تمہیں آج فیصلہ کرنا ہے۔ قیادت کرو گے یا کچرہ بنو گے۔ خاص آدمی بن کر جینا چاہتے ہو یا عامیانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ زندگی بھر اپنی کمزوریاں چھپاتے رہو گے یا اپنی کمزوریاں پر قابو پا کر مثالی آدمی بنو گے۔"

ماں یوں باتیں کرتی رہی جیسے مجھے نہیں سنا رہی ہو بلکہ یہ باتیں بٹنوں کے ساتھ ساتھ قمیصوں میں ٹانک رہی ہے۔ بٹن لگا کر اس نے سوئی دانتوں سے پکڑ لی۔ جس طرح کہ عام طور پر اس کی عادت تھی۔ میرا دل چاہا۔ میں اس سوئی سے اپنی ماں کی زبان سی دوں۔ میری ماں کو اتنی باتیں کرنے کی عادت کیوں تھی۔ اور پھر اسے اتنی باتوں کا پتہ کیوں تھا۔ مائیں تو عام طور پر نیم خواندہ، ناتجربہ کار، لاچار اور تھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں میری ماں اتنی تازہ دم کیوں تھی؟

قمیص تہہ کر کے وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے سوئی منہ سے نکال کے دھاگے کی ریل میں اڑس دی اور قمیص اٹھا کے میری الماری میں رکھنے چلی گئی لیکن اس کا بند منہ پھر کھل گیا۔

"مجھے تو صرف اس خیال نے ہی زندہ رکھا ہوا ہے کہ میں ایک نہایت ذہین اور تیز و طرار بچے کی ماں ہوں اور ایسا بچہ جو دنیا کے ہر چیلنج کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ جو اپنے مخالفوں کو پٹخیاں دے سکتا ہے اور دشمنوں کو اپنے حسن اخلاق سے دوست بنا سکتا ہے۔

اونہہ! میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ایک یہ ہی طریقہ ہے میرے چاند! کہ تم جا کر قدیر صاحب کی ساری غلط فہمیاں دور کر دوں۔ وہ استاد ہیں۔ ان سے معافی مانگ لو۔ کہہ دو کہ سر آپ کو میرے بارے میں سب کچھ غلط بتایا گیا ہے۔ میں بدتمیز اور گستاخ نہیں ہو' پھر ان کی کلاس میں اتنا اچھا کام کرو' اتنی خوش اخلاقی سے رہو' ان کا اتنا احترام کرو کہ وہ اپنے رویے پر خود شرمسار ہو جائیں۔ پھر ایک دن ایسا آ جائے جب تم ہی تم ان کے منظور نظر بن جاؤ گے۔''

اف یہ کس قدر ناممکن تھا۔ میری ماں کو ہمیشہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی عادت تھی۔

چندا! تمہاری فتح یہ ہے کہ ایک دن تم قدیر صاحب کی نظر میں سب سے اچھے ہو جاؤ اور سب لڑکے تمہیں اپنا آئیڈیل سمجھ لیں۔ ایک یہ ہی حل ہے اس مسئلے کا۔ اگر تمہیں منظور ہو تو۔ اگر چہ مشکل ہے۔ مگر مردوں کو تو ہمیشہ مشکل راستہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ڈر جانا اور میدان چھوڑ کے بھاگ جانا عورتوں کا کام ہے۔''

میرے ماتھے کے بل گہرے ہوتے گئے اور ماں کا لہجہ نرم ہوتا گیا۔

میری صورت دیکھ کر بولی۔

چندا! میں تمہیں مجبور نہیں کرتی ۔ میرے بچے! ہوگا وہی جو تم چاہتے ہو۔ میں نے ویسے ہی حالات کا ایک جائزہ لیا تھا۔ تھوڑے دنوں تک سوچ کے مجھے بتا دو! اب تم کون سے سکول میں جانا پسند کرو گے۔ میں طرف سے ہر ممکن کوشش کر کے تمہیں اس سکول میں داخلہ دلوا دوں گی۔''

میں کئی دن تک منہ پھلائے پھلائے بے دلی سے سکول جاتا رہا۔ پھر ایک دن میں نے ماں کی بات پر غور کیا تو مجھے اس میں صداقت نظر آئی۔ یہ سب ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہو رہا تھا جو میرے مخالف لڑکوں نے قدیر صاحب کے دل میں پیدا کر دی تھی۔

جس دن میں قدیر صاحب سے معافی مانگ کر آیا- سارے حالات بدل گئے اور چند دنوں میں میں ان کا منظور نظر تھا اور جماعت کا ہیرو بن چکا تھا مگر ایک خلش میرے دل میں رہتی تھی- میں نے بالکل اسی طرح کیا تھا جس طرح میری ماں چاہتی تھی-

میری ماں کے پاس اپنی باتیں منوانے کا ایک جادو تھا-

میں اپنی ماں کے حربوں سے تنگ آ چکا تھا- مگر جنگ نہیں کر سکتا تھا-

جس دن میرا میٹرک کا پہلا پرچہ تھا- ماں مجھے خود سینٹر چھوڑنے گئی اور راستہ بھر دیانت داری پر ارشادات کے موتی لٹاتی گئی--- واپس پر میں پھٹ پڑا اور میں نے کہا-

”ماں! تمہارے دیانت داری کے درس تمہارے بیٹے کے کام نہیں آ سکتے- آج اندر جا کر دیکھتیں کہ سینٹر میں کیا ہو رہا تھا؟“

”کیا ہو رہا تھا---؟“ ماں نے موٹر چلاتے ہوئے بھولپن سے پوچھا-

”زیادہ تر لڑکے نقل کر رہے تھے اور استاد باقاعدہ نقل کروا رہے تھے- باہر سے بوٹیاں اندر جا رہی تھیں- لوگ ایک دوسرے کو کچھ دے دلا کر پہلے سے معاملات طے کر لیتے ہیں- میں نے خود کئی والدین کو نگران صاحبان سے خفیہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے- میرا تو اندر خون کھول رہا تھا- پیپر میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا- اگر میں تمہارے دیانت داری کے سبق ازبر کرتا رہا تو بس ہو چکا میرا امتحان- اور ایسے امتحان سے میں باز آیا- تم اپنے اصول اپنے پاس رکھو، یہ باتیں کتابوں میں تو اچھی لگتی ہیں، عام زندگی میں مضحکہ خیز اور بھونڈی لگتی ہیں- وہ لڑکے جو ہر روز نقل کر رہے ہیں- علی الاعلان- سب سے زیادہ نمبر لے جائیں گے اور ہم جو سارا سال محنت کرتے رہے ہیں اور دیانت داری کا سبق رٹتے رہے ہیں- سیکنڈ ڈویژن لے کر کالجوں میں داخلے کے لیے جوتے چٹخاتے نظر آئیں گے- میں تمہاری دیانت داری والی پالیسی کو نہیں جانتا اور یہ سب پالیسیاں صرف عورتوں کے لیے بنائی جاتی ہیں؟“

ماں کچھ نہیں بولی اور میں کھولتا رہا۔ جو منہ میں آیا بکتا رہا۔ گھر گیا، زور سے کتابیں دور پھینکیں اور بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔

ماں نے آ کے مجھے منایا۔ پیار کیا اور بڑے پیار سے کھانا کھلایا۔ شام کو جب میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو بولی:

''اچھو! زندہ رہنے کے لیے صرف اتنا ضروری ہے کہ --- انسان کا اپنا دل اور ضمیر --- مطمئن ہو۔ وہ لوگ جو بد دیانتی کرتے ہیں یا نقل کر کے پاس ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی دانست میں ایک --- شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔ مگر وہ بدنصیب یہ نہیں جانتے کہ یہ شارٹ کٹ انہیں زندگی بھر کے لیے چھوٹا بنا دیتے ہیں۔ نقل کر کے پاس ہونے والے لڑکوں میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکار نہیں سکتے۔ ساری زندگی درجہ دوم کے انسان رہتے ہیں۔ ساری زندگی غلط طور طریقے اختیار کرتے رہتے ہیں اور ان کی پوری زندگی اعصابی دباؤ کے تحت ایک نامعلوم سے تشنج میں گزر جاتی ہے۔ وہ اگر کاروبار کریں تو اچھے کاروباری نہیں بن سکتے۔ ملازمت کریں تو قابل احترام باس نہیں بن سکتے۔ ہمیشہ گھٹیا درجے کے خوشامدی ماتحت بن کر گزارا کرتے ہیں۔

اور تم جیسے بچے جو اپنی قوت بازو کو آزما کر میدان میں نکلتے ہیں۔ وہ زندگی بھر دنیا کو للکارتے رہتے ہیں۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے ماں!'' میں نے چیخ کر کہا۔

''ساری دینا کو للکارتا رہوں مگر میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن لے کر پاس ہو جاؤں۔''

ماں بے تحاشا ہنسنے لگی۔

''تمہیں کس نے کہہ دیا ہے کہ سیکنڈ ڈویژن لینے والے بدترین انسان بن کر ابھرتے

ہیں؟ یہ تو ایک ننھا سا امتحان ہے اور تمہارے آگے ایک میدان ہے لیکن میرے بچے تم دیانت داری سے اگر تھرڈ ڈویژن لے کر بھی پاس ہو جاؤ گے تو میں گھر میں چراغاں کروں گی لیکن اگر خدانخواستہ تم نے نقل کر کے فرسٹ ڈویژن لے لی تو میں روحانی طور پر اسی دن مر جاؤں گی۔ ''

ہونہہ! ایک تو یہ مائیں ہر دم مرنے مارنے کے ڈراوے دیتی رہتی ہیں۔ جیسے یہ دنیا ان کے بغیر چل نہیں سکتی اور جیسے یہ نہ ہوں گی تو ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکیں گے۔

دوسرے دن جب میں پیپر دینے جا رہا تھا تو میرے ارادے خطرناک تھے۔ ماں نے مجھے دروازہ کھول کے کار سے باہر نکالا اور میرا ماتھا چوم کر دعا دی۔

پھر کہنے لگی۔

''میری خوشی اسی میں ہے کہ تم دیانت داری سے امتحان دے کر فیل ہو جاؤ، لیکن اگر تم اب بھی نہیں مانو گے تو میں تمہیں حکماً کہوں گی۔ اگر میری نصیحت پسند نہیں تو میرا حکم تمہیں ماننا پڑے گا۔ اور میرا حکم ہے کہ تم امتحان میں ہرگز نقل نہیں کرو گے۔ خواہ سارا سینٹر نقل کرتا رہے۔ ''

ظاہر ہے میں اپنی ماں سے ڈرتا بھی تھا۔ اس لیے سینٹر میں میرے علاوہ چند اور لڑکے تھے جو غالباً اپنی ماؤں کے ڈر سے نقل نہیں کر رہے تھے۔

میں نے بڑی بے دلی سے سارے پیپر دیئے۔۔ جس دن رزلٹ آیا۔ میں کمرے میں پڑا رہا۔ باہر ہی نہ نکلا۔ میری ماں خود گئی اور میرا رزلٹ لے آئی۔

حسب معمول اس نے پہلے آ کر پیشانی کو چوما۔۔۔ پھر سرور سے بھرے لہجے میں بولی۔

''جو بچے اپنے والدین کا کہنا مانتے ہیں وہ کبھی خسارے میں نہیں رہتے۔ دیکھو تمہاری

فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔"

گزٹ میں نے اپنی ماں کے ہاتھ سے چھین لیا اور بے تابی سے سارے رول نمبر دیکھنے لگا۔

جن لڑکوں نے نقلیں کی تھیں، ان کی سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن تھی اور بعض تو واقعی فیل ہو گئے تھے۔

ماں کی ہر بات سچ ثابت ہو جاتی تھی۔ اس لیے میں کھلم کھلا بغاوت نہیں کرتا تھا۔ میرے لاشعور میں کہیں یہ گرہ پڑ گئی تھی کہ میں ماں کا کہا ٹال نہیں سکتا۔ ایک فرمانبردار "معمول" کی طرح چپ چاپ ماں کے ہر حکم کے آگے گردن ڈال دیتا--- شاید یہیں سے اس---نفرت کی ابتداء ہوئی تھی جس کو میں کبھی کوئی نام نہیں دے سکا---!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کالج کی زندگی نے مجھ پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ زمانہ کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے ساری دنیا اپنی مٹھی میں ہے اور کبھی یوں لگتا ہے یہ ساری دنیا ایک بند مٹھی کی طرح ہے اور اپنا تمام تر زور لگا کے اس بند مٹھی کو کھول کر دیکھنے کو جی چاہتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے۔

میرا دوستانہ کچھ اچھے قسم کے لڑکوں سے نہیں ہوا تھا--- اچھی قسم کے لڑکے کالج کی وہ نعمت ہوتے ہیں جو کلاس اٹینڈ کرنے کی خاطر آتے ہیں۔ اساتذہ کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ کالج میں ناموری چاہتے ہیں، اس لیے کتابوں سے آگے ان کا کوئی جہاں نہیں ہوتا۔ باقاعدگی سے نوٹس لکھتے ہیں اور دلجمعی سے ہر لیکچر اٹینڈ کرتے ہیں۔

مگر مجھے دوسری قسم کے لڑکے پسند تھے۔ خوش باش اور بے فکرے لڑکے، جو کالج میں اس طرح آتے تھے جیسے انہوں نے بندشوں کی سب بیڑیاں کاٹ ڈالی ہوں، پڑھائی کے علاوہ...... انہیں ہر بات سے سروکار ہوتا ہے۔ یہ بات جاننا چاہتے ہیں جن کے سامنے

تجربات کا ایک جہاں ہوتا ہے، بھلے دنیا ان کو آوارہ کہتی رہے۔ جتنی جلدی وہ مرد بن جاتے ہیں، پڑھاکو قسم کے لڑکے نہیں بن سکتے۔ میں مرد بن کر اس دنیا میں رہنا چاہتا تھا۔۔۔ اس لیے ان کے گروپ میں شامل ہو گیا۔

ایک دن جب میں اپنی ماں کے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور ماں مجھے غور سے دیکھ رہی تھی یکا یک کہنے لگی۔

''دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔''

میں نے ہاتھ روک کر ماں کی طرف دیکھا۔

میری ماں پر پھر باتیں کرنے کا دورہ پڑنے والا تھا۔

''ایک وہ لوگ جو دنیا کو اپنے اشارے پر چلاتے ہیں اور دوسرے وہ جو دنیا کے اشارے پر چلتے رہتے ہیں۔''

''گو دنیا کو اپنے اشاروں پر چلانے والے بہت کم ہوتے ہیں، مگر دنیا ان کو پسند کرتی ہے۔ ان کی غلام بن جاتی ہے۔

''کوشش تو ہر انسان کی یہی ہونی چاہیے کہ وہ دنیا کے اشاروں کا غلام نہ ہو بلکہ دنیا اس کی غلام ہو۔''

ماں کو فلسفے بگھارنے کی بڑی عادت تھی۔

اور میں ان سنی کر کے بیٹھا رہتا تھا۔ ماں سے بچنے کا یہی آسان طریقہ تھا۔

''جب بچہ نیا نیا چلنا سیکھتا ہے تو دوسرے چلنے والوں کی نقل کرتا ہے۔'' پتہ نہیں ماں کیا کہنا چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

''دنیا کی حقیقت کو جاننے کے لیے ضروری ہے۔ کہ آدمی دنیا سے ذرا مختلف ہو۔ اگر

کوئی شخص کنارے پر کھڑا ہو تو وہ ڈوبنے والے کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ ڈوبنے والے نے غلطی کہاں کی تھی؟ اور پھر ڈوبنے والے کو بچا بھی سکتا ہے۔"

اپنے نفس کے آگے انکار کر دینے والے لوگ کتنے ہوتے ہیں۔۔۔؟

"بہت کم۔۔۔ آٹے میں نمک کے برابر۔۔۔ مگر اس دنیا کو ایسے ہی لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔"

پھر وہ برتن اٹھا کر رکھنے لگی۔

میں نے کھانا ختم کیا تو اٹھ کر جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔

ماں آتے جاتے ہوئے کوئی نہ کوئی بات کہتی رہی۔

پھر ایک دم کھڑی ہو گئی۔۔۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"میں سگریٹ پینے کو برا نہیں سمجھتی۔"

"برا اس بات کو سمجھتی ہوں کہ آدمی دوسروں کے مجبور کرنے پر مجبور ہو جائے یا اس پر خوامخواہ صحبت کا اثر ہونے لگے۔ بیٹا! جب تمہارا اپنا دل چاہے تو سگریٹ ضرور پی لینا مگر صرف اس لیے نہ پینا کہ کچھ دوست تمہیں طعنے دیتے ہیں۔ اور تمہاری مردانگی کو جگاتے ہیں۔ سگریٹ، شراب اور منشیات یہ انسانی فطرت کی کمزوریاں ہیں۔ اپنے آپ کو طاقتور ظاہر کرنے کے لیے۔۔۔ کمزوروں کی پناہ لینا کوئی عقل مندی نہیں۔ سگریٹ پینے والے، شراب پینے والے، پان تمباکو کھانے والے طاقت ور نہیں ہوتے، کمزور ہوتے ہیں اور کمزوروں کا لیڈر بن کے رہنا شاندار بات نہیں ہے۔"

میرا دل دھڑک اٹھا۔

میں نے بہت احتیاط کی تھی مگر ماں کو نہ جانے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ میں سگریٹ پینے لگا ہوں اور سگریٹ میں نے دوستوں کے مجبور کرنے پر ہی شروع کیے تھے۔ دوستوں کے

مجبور کرنے پر اور بھی بہت کچھ کرنے لگ گیا تھا۔

اور اب کھانے کے بعد مجھے سگریٹ کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ میری ماں میری صورت دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر آ کر پاس بیٹھ گئی۔ مسکرا کر بولی۔

"چندا! مرد کو ان سب راستوں سے گزرنا چاہیئے، دیکھنا چاہیے کہ سگریٹ کیا ہے؟ شراب کیا ہے؟ فطرت کی کمزوری کیا ہے؟ مگر صرف تجربے کی حد تک، ان پناہ گاہوں میں پڑاؤ خطرناک ہوتا ہے۔ اپنی مناسب عمر میں سب کچھ کر لینا کہ تمہیں---حسرت نہ رہے مگر ابھی سے نہیں، کچے پھل کو پتھر مار دیں تو اس پر داغ پڑ جاتا ہے، پھر وہ پھل پکتا نہیں۔"

"کبھی تم انکار کر کے دیکھو--- انکار میں کتنا مزہ ہے--- جب آدمی اپنی ہی کمزوریوں کی نفی کرتا ہے اور اپنے دوستوں کے آگے انکار کر دیتا ہے تو اپنے دوستوں میں ممتاز اور منفرد ہوتا ہے اور اپنی نظر میں اس کا مقام اونچا ہو جاتا ہے۔"

پھر میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنی تمام تر ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر کہنے لگی۔

"کتنا خوبصورت ہے تمہارا چہرہ--- ماشاءاللہ---کسی مقدس کتاب کی طرح روشن اور بے باک۔

اور دانت تو بس---موتیوں کی طرح ہیں، انہیں ابھی سے دھواں نہ لگانا۔ سارا چہرہ جھلس جائے گا اور دانتوں پر داغ رہ جائیں گے---اس چہرے نے ابھی دنیا میں بہت کام کرنے ہیں اور مرد کا سارا کیریکٹر اس کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔"

میں نے نظریں جھکا لیں۔

ماں نے اس دن کے بعد سے کچھ بھی نہیں کہا۔

مگر میں سوچنے لگا، انکار کر کے دیکھنا چاہیے۔ اپنے نفس کی نفی کر کے دیکھیں تو کیسی لگتی

ہے۔ ویسے مذاق مذاق میں، میں نے سگریٹ پینا شروع کر دیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں نے سگریٹ چھوڑ دیئے۔

سگریٹ چھوڑے تو دوستوں میں الگ سے جانا جانے لگا۔

مگر بات صرف ایک سگریٹ ہی کی نہ تھی، یہ دنیا تو بلاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ حالانکہ ماں نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں لڑکیوں کے گرد نہ منڈلاؤں ان کے ساتھ ڈیٹنگ --- نہ کروں۔

ماں کو میری سب کارروائیوں کا پتہ ہوتا تھا۔ جب میں بہت سی خوشبوئیں چھڑک کے باہر نکلتا تو وہ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکراتی جیسے بہار کے موسم میں چاندنی پھولوں پر رقص کرتی ہے پھر کہتی:

''ماشاءاللہ --- بے چاری دل تھام کے رہ جائے گی۔''

میں بھی ہنس دیتا۔

کہتی:

''کب تک آ جاؤ گے''

''بس آ جاؤں گا ماں۔'' میں کہتا۔

''پکچر کے بعد کہیں کھانا کھانے بھی جاؤ گے؟''

''جاؤں گا تو سہی ---!''

میں نظریں ادھر ادھر کر لیتا۔

''اچھا جب چاہو چلے آنا، مگر بچے رات کے وقت کار تیز نہ چلانا۔''

جب سے میں نے ملازمت کی تھی اپنا سکوٹر بیچ دیا تھا۔ ماں نے مجھے ایک سیکنڈ ہینڈ کار لے دی تھی۔

اور مجھے گھر سے وقت بے وقت آنے جانے کی آزادی تھی۔

ایک دن صبح بڑی رنگین تھی اور میں نے ماریہ کے ساتھ رات کا پروگرام بنایا تھا۔

ماریہ میرے دفتر میں میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ کئی دنوں سے ہم یک جان دو قالب ہوئے پھرتے تھے۔

رات کے لیے میرے جی میں ایک رنگین پروگرام تھا۔

سارا دن میں گھر پر ہی رہا کیونکہ اس روز چھٹی تھی اور جس رات مجھے دیر تک باہر رہنا ہوتا۔ میں سارا دن ماں کے قریب رہ کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

ماں نے سر میں تیل لگا رکھا تھا۔ چائے کی پیالی پکڑ کر میرے کمرے میں آ گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ماں سے یہ کبھی توقع نہیں رکھنی چاہیے تھی کہ وہ محض ادھر ادھر کی باتیں ہی کرتی رہے گی۔ نہ جانے سب کچھ پہلے سے اس کی ذہن میں موجود ہوتا یا وہ وہیں بیٹھے بیٹھے ترتیب دے لیتی۔ مگر اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ بظاہر ایک معمولی سی ماں جو کسی معمولی سے دفتر میں ملازم تھی۔ سر پر خرد کا ٹوکرا اٹھائے رکھتی۔

ماں جب میرے کمرے میں آتی، تو میں لاشعوری طور پر جائے پناہ ڈھونڈنے لگتا۔ دل چاہتا ماں ٹل جائے۔ مگر اندر سے آواز آتی اس کی سن لو۔ عجیب بات ہے ماں مجھ کو مجھ پر بے نقاب کر رہی تھی۔ اس کی باتوں سے میں اپنے آپ پر کھلتا جا رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ اپنی بڑائی جتانے آتی تھی یا مجھے بے نقاب کرنے --- باوجود اس سے نفرت کرنے کے میں نے اس کی باتوں سے ہمیشہ اپنی کسی خفیہ عادت کا سراغ لگایا۔ کوئی چھپا ہوا گوشہ تلاش کیا اور مجھ میں رفتہ رفتہ خود شناسی کی عادت پیدا ہونے لگی۔

کبھی کبھی میں یہ بھی چاہتا کہ ماں کچھ ضرور کہے۔ اس کی باتوں سے یہ راز منکشف ہوتا کہ وہ میرے بارے میں کتنا جانتی ہے؟ میری زندگی کا سارا عکس ماں کے آئینے میں نظر

آنے لگا تھا۔ مجھے یہ بھی برا لگتا تھا۔ جوان بیٹے کی زندگی کا ایک ایک ورق ماں کے سامنے کھلا نہیں ہونا چاہیے۔ بعض اوراق ماؤں کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ ہونے چاہئیں کیونکہ بیٹے کو کیچڑ میں لت پت کوئی ماں نہیں دیکھ سکتی مگر کیچڑ میں لت پت ہوئے بغیر جوانی کی راہگذر روندی بھی نہیں جا سکتی۔ ماں جانتی تھی میں اکثر لڑکیوں کے ساتھ گھومتا ہوں اور اس نے مجھے ایک روز کہا بھی تھا:

''لڑکیوں کے ساتھ گھومنے سے لڑکیوں کی سمجھ آتی ہے۔۔۔''

ہاں مجھے اعتراف ہے میری ماں دانا بینا تھی اور وقت کے تقاضوں کو پہچانتی بھی تھی، مگر شاید مجھے اس کے آگے احساس کمتری ہونے لگتا تھا کہ وہ عورت ہو کر اتنا کچھ جانتی ہے اور میں مرد ہو کر بودا ہوں۔

یا یہ بات اس طرح تھی کہ وہ اپنا سارا علم اور تجربہ اور مشاہدہ ایک دم میرے اندر انڈیلنا چاہتی تھی مگر میں یہ سب کچھ اپنے آپ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں ہمارا کیا رشتہ تھا۔ مگر ماں ایک سازش کے طور پر میری زندگی میں سرایت کرتی جا رہی تھی اور اس کی یہی بات مجھے بری لگتی تھی۔

اس روز ماں واقعی ادھر ادھر کی ہانکتی رہی تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ ماں تو عقل کی پٹاری تھی اور اسے اس کا احساس بھی تھا۔ اس لیے عقل کی باتوں کی طرف اشارہ ضرور کرتی تھی۔ میں حیران تھا۔ ماں صرف ماں ہی بنی رہی۔ چائے پی کر اس نے پیالی ایک طرف رکھ دی اور میں سوچنے لگا۔ شام کو کون سے کپڑے پہن کر جاؤں اور کس طرح اپنی شخصیت کو جاذب نظر بناؤں۔۔۔''

اسی وقت ماں کھڑی ہوگئی۔ میری وارڈ روب کھول کر میرے کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ سیاہ دھاری دار سوٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی:

''آج یہ پہن لو۔ اس کے ساتھ گلابی چیک کی قمیص تمہیں بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ ٹائی باندھ لو جس میں گرے مسٹرڈ اور گلابی پٹیاں ہیں۔ ویسے تو ماشاء اللہ تم بہت خوش لباس ہو لڑکیاں تمہارے لباس کی داد تو دیتی ہوں گی۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ واقعی کئی لڑکیوں نے میرے لباس کو سراہا تھا۔

پھر ماں گھوم گئی اور بولی۔

''لڑکیوں کو اس عمر میں لباس کی اتنی سمجھ نہیں ہوتی۔۔ بس وہ تو یہ دیکھتی ہیں۔ لڑکا مجھ میں کس حد تک دلچسپی لیتا ہے۔ ہے نا؟''

میرا خون چہرے پر آ گیا۔ میں نے سوچا۔ اب ٹل جاؤ ورنہ ماں شروع ہو جائے گی۔ ماں نے ہنس کر کہا۔

''لڑکیاں بڑی معصوم ہوتی ہیں۔

اور مرد کو ان کی معصومیت کا احترام کرنا چاہیے۔''

پتہ نہیں اب ماں کیا کہنا چاہتی تھی۔

یونہی گھوم پھر کے میرا کمرہ دیکھتی رہی۔ پھر ایک کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرتے کرتے یوں بولنے لگی جیسے کوئی دلچسپ بات پڑھ رہی ہو۔

''بیٹا! زندگی کا ایک اصول بنا لو۔ معصوم اور کنواری لڑکیوں کو بخش دیا کرو۔ اس عمر میں حد بندیاں اچھی نہیں لگتیں مگر نوجوان نہیں جانتے۔ ضمیر کے بوجھ ان کے کیریئر کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ضمیر کا بوجھ اٹھا کر زیادہ دیر چلا نہیں جاتا۔ ویسے اسی معاشرے میں دوسری قسم کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو دلبستگی کے لیے ٹھیک ہوتی ہیں۔ جان بوجھ کر کسی بھلے گھر کی شریف لڑکی کو خراب کرنا کمینگی ہوتی ہے اور یوں بھی۔۔۔ فضول قسم کی لڑکیوں کے ساتھ گھومنے سے شریف لڑکی کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ہر شریف لڑکی کسی کی امانت ہوتی ہے۔۔۔

کم از کم تم خیانت کا بوجھ نہ اٹھانا۔ ویسے تو آج یہ دنیا، یہ زمانہ تمہارا ہے۔"

یہ کہہ کر ماں یوں کمرے سے باہر نکل گئی جیسے اسے چولہے پہ رکھی ہوئی ہنڈیا یاد آ گئی ہو

میں جب بن ٹھن کے ماریہ کے گھر پہنچا تو وہ میری راہ تک رہی تھی۔ ماریہ آج غضب ڈھا رہی تھی۔ ماریہ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں آج رات اظہار محبت کرنے والا ہوں مگر اظہار محبت کے علاوہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ خوب صورت پھول کسی کے ہاتھ میں ہو تو وہ اسے مسلے بغیر نہیں چھوڑتا۔ جب ماریہ کار کی اگلی سیٹ پر میرے ساتھ آ کر بیٹھی تو میں نے اس کی خوب آنکھوں میں دیکھا۔۔۔ اور تھرا گیا۔

ماں کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

ماریہ معصوم تھی۔۔۔ مقدس تھی۔ اس کی آنکھیں مسجد کے صحن کی طرح شفاف اور روشن تھیں۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا۔ ابھی تک کسی نگاہ بد نے اسے نہیں چھوا۔

وہ بند لگی تھی۔

زمانے سے نا آشنا تھی۔

کل تک اس کی یہی لاعلمی اور معصومیت میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔

اور آج مجھے اس کی قربت سے خوف آ رہا تھا۔

مجھے اس کے ساتھ محبت نہ تھی۔

دوسرے نوجوانوں کی طرح میں بھی اپنی جوانی کی تاریخ مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اوائل جوانی میں ان باتوں کو نوجوان اپنے کارنامے گردانتے ہیں۔ معصوم لڑکیاں یہ سب نہیں جانتیں۔ کیونکہ مرد کی آنکھیں ہمیشہ جھوٹ بولتی ہیں اور عورت کی آنکھیں سچی ہوتی ہیں۔ ان سچی آنکھوں سے مجھے خوف آنے لگا۔

میں ان سچی آنکھوں کو خون کے آنسو رلانے والا تھا۔ آج رات کے بعد وہ آنکھیں

رویا کریں گی، مجھے کوسا کریں گی اور ان لمحوں کو یاد کر کے شرم سے جھک جایا کریں گی-

''معصوم اور کنواری لڑکیوں کو بخش دیا کرو-''

میری ماں ایک ظالم عورت تھی-- جس لمحے پر اس کا حق نہ تھا، اس لمحے پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی- اس حد تک کوئی ماں اپنے بچے کی زندگی میں داخل نہیں ہوتی- اتنی دور تک کوئی ماں انگلی پکڑ کر ساتھ نہیں چلتی---!

اف---!

مجھے اپنی ماں سے گھن آنے لگی-

میری ساری معطر رات برباد ہوگئی-

میرے رویے پر ماریہ حیران ہوتی رہی مگر میں اسے کھانا کھلا کر اس کے گھر چھوڑ آیا- میں نے اسے وہ خوش خبری نہ سنائی جو آج رات سنانے والا تھا-

انسان کتنا ہی سخت جان کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ سمجھ کے نہیں کرنا چاہتا- ہر ایک نے اپنے پاس کوئی نہ کوئی جواز چھوڑا ہوتا ہے- جواز کے پرخچے اڑ جائیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟

ہاں ایک موقع ایسا آیا جس پر میری ماں چپ رہی-

میں دو سال کے لیے امریکہ جا رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس موقع پر میری ماں مجھے اتنی نصیحتیں کرے گی- اتنی ہدایات دے گی کہ اس کی ہدایات سے میرا باقاعدہ ایک صندوق بھر جائے گا- جسے اٹھا کر اتنی دور لے جانا میرے لیے کافی مشکل ہوگا- مگر پھر میں نے دل میں سوچ لیا کہ اسے نصیحتوں کا صندوق بھرنے دوں گا- پھر اس صندوق کو جاتے ہوئے ایئرپورٹ پر چھوڑ جاؤں گا- ماں کی نصیحتوں کے پلندے اٹھائے اٹھائے امریکہ میں گھومتے رہنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ جب کہ مجھے امریکہ جانے کا بہت ارمان تھا اور بہت منتوں اور مرادوں کے بعد یہ دن آیا تھا-

ماں بڑی خاموش تھی-

اور خاموشی سے میرا سامان تیار کر رہی تھی-

میں کبھی کبھی ماں کو کچوکا لگا دیتا تھا یہ کہہ کر:

“فلاں موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہیے ماں!”

ماں ہولے سے مسکرا دیتی-

اور جب میں نے بہت کریدا تو سوگواری سے ہنس کر بولی-

“ساری زندگی جو کچھ میں تجھے کہتی رہی ہوں- وہ آج کے لیے تو تھا اور میں کتنی خوش ہوں کہ تیرے دل میں سب امانتیں موجود ہیں-”

اور جب میں اس کی خاموشیوں کا مذاق اڑاتا رہا تو رخصت کے وقت بس اتنا کہا-

“تمہارے سامنے ایک بہت بڑا جہان ہے اور میرا دل چاہتا ہے میرے سہارے کے بغیر تم اس جہان کو تلاش کرو- تا کہ تمہیں بھی علم ہو کہ تم کتنے پانی میں ہو- اچھو! میں تمہیں جان بوجھ کے اپنے سے دور بھیج رہی ہوں- مجھے معلوم ہے میں نے ضرورت سے زیادہ تمہاری رفاقت کا دم بھرا ہے- بعض اوقات بہت آگے جانے کی کوشش بھی کی ہے- شاید وہ میری مامتا کا تقاضا تھا- مگر اب میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بغیر رہو- تم “تم” بن کر رہو- اپنی مرضی سے رہو- اپنی خوشیاں آپ چنو- تمہیں اپنی راہبری میں جینے کا حق ہے- میں اس طرح تمہارا انتظار کروں گی جس طرح کوئی امتحان دے کر اس کے رزلٹ کا انتظار کرتا ہے-”

وہاں کر مجھے احساس ہوا کہ میں تو ماں کی ہدایات سے لدا ہوا آیا تھا- میں اس اونٹ کی مانند گھوما کرتا جس پر بے تحاشا سامان لدا ہو مگر جس کا مالک دور و پار کہیں نظر نہ آتا ہو-

مجھے ہر قدم پر اپنے بھاری بھر کم ہونے کا احساس ہوتا اور یہ جان کر مجھے بڑی خوشی

ہوتی کہ دنیا کی اس تجربہ گاہ میں گو ہر تجربہ نیا ہوتا ہے، مگر میرے پاس آگہی کی دولت تھی اور شاید یہ دولت لاشعوری طور پر میری ماں نے مجھے بخشی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے دو سال امریکہ میں خوب عیش و نشاط کی زندگی بسر کی۔ اپنے آپ کو برتا بھی۔ مگر دو باتوں کی سمجھ مجھے خود بخود آ گئی کہ رزق اپنی زمین پر جا کر کمانا چاہیے۔ جاتے وقت ماں نے مجھے یہ بات نہیں کہی تھی۔ یہ کچوکا میں نے ماں کو لگایا تھا اور طنزیہ انداز میں کہا تھا:

''ماں اگر مجھے کوئی امریکی لڑکی پسند آ گئی تو؟''

''تو---!'' وہ مسکرا کر بولی۔

''میں اس سے شادی کر لوں؟''

''اگر معاملہ شادی تک گیا تو ضرور کر لینا۔ شادی کرنے میں کیا حرج ہے!''

''لیکن تم ایک غیر ملکی بہو کو برداشت کر لو گی؟''

''بیٹا! میں اپنے بچے کی ہر خوشی برداشت کر سکتی ہوں اور پھر یہ فیصلہ تمہارا ہو گا۔ تمہیں نبھانا ہو گا، مجھے تو صرف قبول کرنا ہو گا۔''

''سوچ لو--- میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں۔''

ماں پھر ہنسنے لگی۔

''یہ موقع تو میں تجھے دے رہی ہوں۔''

''پھر نہ کہنا کہ میں نے پاکستان میں۔ پاکستانی طریقے سے شادی کرنا تھی۔''

''ارے نہیں--- اب ان باتوں کا زمانہ نہیں رہا۔ بچوں کی شادی بچوں کی خوشی کے مطابق کرنی چاہیے۔''

''جو لڑکی تمہارے دل میں گھر کر جائے گی وہی میری بہو بنے گی۔''

اگر جاتے وقت ماں یہ کہہ دیتی کہ خبردار وہاں سے شادی نہ کر کے آنا۔ میں نے بہت دکھ اٹھا کے تمہیں پالا ہے۔ اور تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کا بڑا ارمان ہے' وغیرہ وغیرہ۔۔۔ تو گویا وہاں شادی کرنے میں میری راہ ہموار ہو جاتی۔

اور ماں کو جیسے یقین تھا کہ میں یونہی چلا آؤں گا۔

اس لیے جب میں واپس آ کر ملازمت میں مگن ہو گیا تو ایک دن بڑی رسان سے بولی۔

''وہاں سے بھی تنہا چلے آئے اور یہاں بھی تنہا رہنا چاہتے ہو۔''

''کیوں ماں؟''

''ہاں۔ میں نے تو یہی سمجھا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح میری ہر ذمہ داری تم بانٹ لو گے۔ شادی کر کے مجھے اطلاع دے دو گے مگر تم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔''

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

''ماں تو بڑی چالاک ہے۔''

ماں نے ہنسی اپنے ہونٹوں میں ہی دبالی اور کہنے لگی:

''مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ گلی گلی کوچے کوچے پھر کے تیرے لیے لڑکی تلاش کروں۔ آج کل کے لڑکے باہر ہی لڑکیاں پسند کر لیتے ہیں۔ پھر آ کے ماں کو بتا دیتے ہیں۔ اس طرح مائیں سردردی سے بچ جاتی ہیں۔''

اس طرح سردردی شروع ہو جاتی ہے ماں۔۔۔ مائیں ایسی لڑکی کو قبول نہیں کرتیں جس کی تلاش اور پسند میں ان کا عمل دخل نہ ہو۔''

''میں ان ماؤں میں سے نہیں ہو بیٹا۔۔۔ اور میں اپنی زندگی اچھی بری گزار چکی ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایک ملازمت پیشہ عورت ہوں۔ مجھے ایک ڈھنگ سے رہنے

کی عادت پڑ گئی ہے- جب تک اللہ توفیق دے گا- ملازمت کرتی رہوں گی- اس کے بعد مجھے میری پنشن کافی ہوگی- میں تو تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اور نہ تمہاری بیوی کی زندگی میں دخل در معقولات کرنا چاہتی ہوں- اسے اپنی زندگی اپنی مرضی کے ساتھ گزارنے کی اجازت ہونی چاہیے-"

"تو گویا آپ مجھے پہلے سے بتا رہی ہیں کہ آپ میری بیوی کو اپنے ساتھ نہیں رکھیں گی- اگر یہ صورت حال ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے شادی کرنے کی-"

"اچھا اب بات کو الٹے معنی نہ پہنا- بس میرا اصول ہے کہ بہو کو الگ رکھنا چاہیے- ہر لڑکی اپنے خواب دیکھتی ہے اور اپنے خوابوں کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتی ہے- ساس نے ایک پورا زمانہ دیکھا ہوتا ہے اور اس کے سامنے مکمل گھر ہوتا ہے- اس لیے اسے بہو کے جھول نظر آنے لگتے ہیں اور بہو ساس کو جاہل اور پرانے زمانے کا کہنے لگتی ہے- بھئی تمہیں تو اس ملازمت کے سلسلے میں الگ گھر مل سکتا ہے نا؟ تم اپنی بیوی کو وہیں لے جانا- میں یہاں تنہا رہوں گی-"

"اچھا تو ماں! دوسرے لفظوں میں مجھے اس گھر سے بھی بے دخل کر رہی ہو-"

"یہ مذاق نہیں ہے اچھو!" ماں بولی-

"اب تم اپنی شادی کا خود فیصلہ کرلو-"

"فرض کرو ماں--- میں خود فیصلہ نہ کرسکوں تو---؟"

"کیا تمہاری نظر میں کوئی لڑکی نہیں---؟"

"میری نظر میں اور جان پہچان میں بھی سینکڑوں لڑکیاں ہیں-"

"پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"ماں! تم جانتی ہو میری زندگی کے سارے اہم فیصلے تم نے کیے ہیں- علی الاعلان کیے

ہوں یا غیر محسوس طریق پر---تم ہی سب کرتی رہی ہو۔ اب یہ فیصلہ میں کیوں کروں گا---؟’’

‘‘اچھو! تو بہت چالاک ہو گیا ہے۔’’

‘‘ہاں! تمہارا بیٹا ہوں نا!’’

میں کھڑا ہو گیا۔

‘‘اور میں اپنی بیوی کو ساری زندگی یہ تکلیف دینا چاہتا ہوں کہ وہ میری نہیں، میری ماں کی پسند ہے۔ آخر بیوی کو کچوکے لگانے کے لیے شوہر کے پاس کوئی تو جواز ہونا چاہیے۔’’

‘‘کمینہ---’’

بہت دنوں کے بعد پھر ایک دن ماں میرے کمرے میں آ گئی۔ کہنے لگی ‘‘میرے ملنے والوں میں کچھ لڑکیاں ہیں۔ مجھے پسند بھی ہیں۔ تم ان کو دیکھ لو جو تمہیں پسند آ جائے۔ میں اس کے ساتھ بات چلا لوں۔’’

‘‘میں کیوں دیکھوں ماں---؟’’

‘‘بھئی شادی جو تمہیں کرنا ہے۔’’

‘‘میں سمجھتا ہوں، میری ماں کو معلوم ہونا چاہیے، مجھے کس قسم کی لڑکی پسند آ سکتی ہے۔’’

‘‘نہیں اچھو---! میں صرف طبیعت کا اندازہ لگا سکتی ہوں، شکل و صورت تمہاری پسند کی ہونی چاہیے۔’’

‘‘بس ماں دیکھنے میں اچھی لگے۔ اتنی خوب صورت بھی نہ ہو کہ مجھے جوتے کی نوک پر رکھے اور اتنی بدصورت نہ ہو کہ میں گھر آنا چھوڑ دوں۔’’

‘‘اچھو تمہاری اس بات سے مجھے ڈر لگتا ہے۔’’

‘‘اچھو---!’’ ماں آہستہ سے بولی۔ ‘‘عمر بھر کا معاملہ صرف شکل و صورت سے طے

نہیں پاتا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لیے بہت حوصلے والی لڑکی کی ضرورت ہے۔ تمہارا مزاج سارا اپنے باپ پر ہے۔”

“تو میں کیا کروں ماں۔۔۔؟”

“فیصلہ تو تم ہی کرو گے۔۔۔!”

“ماں! مجھے معلوم ہے۔ تم نے لڑکی دیکھ رکھی ہے۔ بلکہ فیصلہ بھی کرلیا ہے۔ بس اب حسب عادت میرے منہ سے اگلوانا چاہتی ہو۔ نکالو اس لڑکی کو باہر اور مجھ سے ہاں کروالو۔”

“اچھو! تو بڑا تلخ ہو گیا ہے۔”

“ماں تو جانتی ہے کہ وہ ضرور ہوگا، جو تو چاہتی ہے۔”

اس دن تو میری ماں کھسیانی ہو کر اٹھ گئی۔

لیکن پھر وہی ہوا۔ اس نے اپنی پٹاری میں سے لڑکی نکال لی۔

یہ رابعہ تھی۔ میری ماں کی پیاری بھتیجی۔ میری ماں کا ایک ہی بھائی تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اس بیٹی میں ماں کو دنیا بھر کے گن نظر آتے تھے۔ رابعہ کبھی ہمارے گھر پر آ کر رہا کرتی تھی۔ جن دنوں وہ ہمارے گھر پر رہتی، ساری توجہ ماں کے کاموں کی طرف دیتی۔ میری طرف تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ سنا ہے دو سال جو میں امریکہ میں رہا تھا، ماں نے وہ پورے دو سال رابعہ کو اپنے پاس رکھا تھا۔ اور انہی دنوں اس کے اندر اس گھر کا سارا سسٹم انڈیل دیا ہوگا۔ ماں نے پھر اپنے طور پر رابعہ کو میرے لیے تیار کرلیا تھا۔ مجھے اندر ہی اندر ماں کی اس عادت پر غصہ بھی آیا مگر اس سے مفر بھی نہیں تھا۔ بالاخر مجھے ایک فرمانبردار معمول کی طرح گردن ڈال کے آگے بڑھ جانا تھا۔

جس روز میری بارات جانا تھی۔ ماں میری اچکن استری کر کے میرے کمرے میں لائی اور بولی:

''اس کو ذرا۔۔۔ٹرائی کر لینا اور وقت سے پہلے تیار ہو جانا۔ لوگ سہرا بندی کی رسم ادا کرنے ذرا پہلے چلے آئیں گے۔'' وہ میرے کمرے میں میرے کپڑے لٹکاتی رہی۔ دھیمی دھیمی آواز میں باتیں کرتی رہی۔ شادی کا حساب کتاب سمجھاتی رہی۔ میرے جانے سے پہلے اس کے اندر والی کھڑکی کھل گئی۔۔۔ ماں سے پھر ناصح بن گئی۔

''رابعہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کی تربیت میں نے کی ہے۔ اس کے باوجود کسی لڑکی کی فطرت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب وہ بیوی بنتی ہے۔ اس طرح کسی لڑکے کا کردار اس وقت کھل کر سامنے آتا ہے جب وہ شوہر بنتا ہے۔ شوہر بیوی کا یہ روپ ایک دوسرے کے لیے ہوتا ہے۔ جب لڑکی اور لڑکا دن رات ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں، تب ایک دوسرے پر کھلتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتی کہ وہ دنیا کی بہترین لڑکی ہے، مگر شاید بہت سی لڑکیوں سے اچھی ضرور ہے۔

اب آج کے بعد تم اسے جو بناؤ گے، وہی بن جائے گی۔ بیوی شوہر کا پرتو ہوتی ہے۔ بیوی کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے شوہر کو اپنے نفس پر قابو ہونا چاہیے۔''

ماں کی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔

ماں جب کچھ کہنا چاہتی تھی تو وہ رک جاتی تھی۔ تڑپاتی تھی۔ پھر اپنی گفتگو کا پرندہ رہا کرتی تھی۔

''اصل بات تو یہ ہے۔

کہ پہلی رات فیصلہ ہو جاتا ہے، کون بیوی ہو گی۔ کون شوہر ہو گا۔۔۔؟''

''دیکھا! میں آئینے کے آگے کھڑا ہو گیا۔ میری ماں پہلی رات میں بھی گھس آئی تھی۔ اس نے میری پہلی رات کو بھی نہیں بخشا تھا۔ وہ میرے حجلۂ عروسی تک چلی آئی تھی۔ اس کو یہ

بھی گوارا نہیں تھا۔ اپنے چھپر کھٹ پر میں اپنی مرضی سے جاؤں--- وہاں کے اختیارات پر بھی میرا اختیار نہیں تھا۔ کس قدر خودغرض اور ظالم تھی میری ماں۔

میری شادی اپنی مرضی سے کی---

میرا لباس اپنی مرضی سے تیار کیا۔

اور اب

اور اب چاہتی ہے میں دلہن کا گھونگھٹ بھی اس کی مرضی کے مطابق اٹھاؤں۔ دل چاہنے لگا۔ اس سہرے اور اچکن کو آگ لگا کر گھر سے باہر نکل جاؤں۔ ایسی زمین پر چلا جاؤں جہاں میری ماں نہ ہو۔

اس وقت خیال آیا۔ اے کاش! میں نے امریکہ میں شادی کر لی ہوتی۔ زندگی کی سب سے خوب صورت رات تو میرے اختیار میں ہوتی---؟

یوں شادی کے روز سب لوگ خوش ہوتے ہیں مگر میں اندر ہی اندر پھنکتا رہا۔ غصے سے تنا رہا۔ شکر ہے اس دن میرے چہرے پر میرا سہرا تھا۔

رات کو مجھے رابعہ سے ماں کے رویے کا بدلہ لینا تھا۔ ظاہر ہے اور کون تھا جس سے میں اپنے جنم کا بدلہ لے سکتا تھا اور پھر رابعہ کو بھی تو میری ماں نے ہی مہیا کیا تھا۔ وہ بے چاری سخت حیران تھی کہ میرا رویہ اکھڑا اکھڑا کیوں ہے۔

میں جلدی سو گیا اور وہ رات بھر جاگتی رہی---

پھر اپنے آپ فیصلہ ہو گیا کہ اس گھر میں کون شوہر ہوگا اور بیوی کون---؟

اس کا اندازہ مجھے دوسرے دن ہوا۔ صبح کو رابعہ نے ماں سے کچھ نہیں کہا تھا یا شاید کہہ ہی دیا ہو تو اس نے ظاہر نہیں کیا تھا--- سب کچھ بڑے خوب صورت طریقے سے ہوتا رہا۔ رات بھر سونے سے میں صبح تازہ دم اٹھا تھا مگر میرے ضمیر پر میرے رات کے رویے کا بوجھ تھا

دوسری رات جب میں اندر آیا تو رابعہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا- میں نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا تھا یا پھر اس نظر سے نہیں دیکھا تھا- جب اس نظر سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ تو خطرناک حد تک خوب صورت لڑکی تھی اور شاید ماں نے مجھے اس کی خطرناک خوب صورتی کا احساس دلایا تھا- میں جب بات کرتا وہ مسکراتی اور اس طرح مسکراتی جیسے شراب کے پیالے چھلکا رہی ہو- میں نے جب اس کو چھوا تو ایسے لگا جیسے میں نے پھولوں کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال دیا ہے- پتہ نہیں ایسی لڑکیاں کہاں پہ بنتی ہیں- میں نے اس کو محسوس کر کے شراب کا ایک گھونٹ پیا اور سوچا---شاید گھروں کے اندر مکمل ماؤں کی بیٹیوں میں ایسی لڑکیاں پلتی ہیں جن کی پلکوں پہ حجاب ہوتا ہے- جن کی سانسوں میں گلاب ہوتا ہے اور جن کا وجود شراب ہوتا ہے-

حیا اور شباب کا سنگم مرد کو پاگل بنا دیتا ہے---!

میں پاگل بن جاتا- مگر میری ماں مجھے بروقت بچا لے گئی- کل کی رات بہت خطرناک تھی-

اور کل کی رات نے ہی رابعہ کو میرے بارے میں سمجھا دیا تھا-

وہ اتنی خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی، اس کے انداز میں انکساری تھی- اس کے رویے میں تابعداری تھی اور اس کے احساس میں خودسپردگی تھی- وہ اپنے آپ کو میرے سپرد کرنا چاہتی تھی- وہ میرے مبہم رویے کی وجہ جاننا چاہتی تھی- اسے اپنے حسن کی تذلیل کا افسوس نہیں تھا اسے تلافیوں کی لگن لگی ہوئی تھی-

پہلی رات میں اسے ایک بہادر آدمی بن کر ملا تھا اور خوب صورت لڑکیاں بہادر مردوں کو پسند کرتی ہیں، جو سیج پر خود ان کی نفی کر دیتا ہے-

واللہ میں بہادر نہیں تھا-

حسن میری بھی کمزوری تھا۔

کل پتہ نہیں کیا ہو جاتا---؟

مگر آج کی رات کل سے بھی زیادہ حسین تھی۔ ہم ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے۔ مجھے کل کی بے حسی کا خیال بھی تھا۔ اسے کل کی لٹ جانے والی رات کا ملال بھی تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی مسافت طے کر رہے تھے۔ اور زندگی کے خوبصورت لمحے ہم پر نثار ہو رہے تھے۔

مرد کو ایک مرکز پر رہنا پسند نہیں۔ پہلے اپنے رویے سے عورت کے ہوش اڑا دیتا ہے۔ مگر پھر اپنے ہی رویے سے اس کا دماغ ٹھکانے پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے رابعہ پر اپنا طریقہ واردات بھی شروع کر دیا تھا۔

میں باغی اس دن ہوا جس دن میں نے اپنے کانوں سے سنا۔ رابعہ میری ماں سے رو رو کر شکایت کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

''پھپھو! جب مجھ سے---کوئی کام غلط ہو جاتا ہے' اسی وقت طعنہ دینے لگتے ہیں اور کہتے ہیں تم میری پسند نہیں ہو۔ زبردستی ماں نے تمہیں میرے گلے منڈھ دیا ہے۔''

''اس کو بک بک کرنے دو۔'' ماں نے اس طرح آرام سے کہا جیسے میں اس کا اکلوتا بیٹا نہیں ہوں۔

''پروا بھی نہ کیا کرو اس بات کی---محض تمہیں تنگ کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اس کان سے سنو اور اس سے نکال دو۔ مرد بہت سی باتیں انتقاماً کہتے ہیں۔ تمہارے سوا اور کون لڑکی اسے سنبھال سکتی ہے۔ جس وقت شوہر بغیر کسی قصور کے ہر وقت بیوی کو کوستا رہے' طعنے دیتا رہے اور کچوکے لگاتا رہے تو اس کا مطلب ہے وہ اپنے آپ کو بیوی سے کمزور سمجھنے لگا ہے۔ اس وقت بیوی کو درگزر سے کام لینا چاہیے۔''

میں ماں کی بات سن کر تھرا اٹھا۔

''نہیں، نہیں --- میں رابعہ کو ماں نہیں بننے دوں گا۔'' میں نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے پر عمل کرنے میں پورے تین سال لگ گئے۔

جس دن میں نے ماں کو بتایا کہ میں امریکہ جا کر بس رہا ہوں۔ میری ماں کے چہرے پر ایک گھٹا سی چھا گئی۔ وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھتی رہی۔

''یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔''

اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا ماں! کہ تم اپنی بیوی کو لے کر الگ رہنا۔ میں ایک ملازمت پیشہ عورت ہوں اور میری زندگی کا ایک ڈھنگ بن گیا ہے۔''

''ہاں کہا تو تھا۔'' ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا ''لیکن تین سال میرے ساتھ رہ کر تم نے مجھے اپنی عادت کیوں ڈالی؟''

''لو اور سنو ماں --- تم اتنی بہادر عورت ہو۔ ساری زندگی مجھے بہادر بننے کی تلقین کرتی رہی ہو۔''

''ہاں --- مگر اب تو ساری زندگی گزر گئی ہے۔'' ماں نے بڑی مایوسی سے کہا۔

''ماں! ہم تم سے ملنے آیا کریں گے۔''

ماں خاموش ہو گئی۔ زمین کی جانب دیکھنے لگی۔ کئی دن تک اسے چپ لگی رہی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ماں کو شکست دے دی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ ماں خود اپنے فلسفے کی کاٹ میں آ گئی تھی۔ اب ماں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور میں ماں کی پرچھائیں اپنی ازدواجی زندگی پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ساری عمر ماں کا فلسفہ میری باگیں پکڑ کر مجھے ادھر ادھر بھگاتا رہا تھا۔ میں اپنے بچوں کی پرورش اپنی مرضی کے مطابق کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی اولاد پر اپنی

چھاپ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنی بیوی کو ماں سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ اس پر بھی خطرناک حد تک ماں کا رنگ چڑھ رہا تھا۔

جس دن ہم سب امریکہ کے لیے روانہ ہوئے میرا بیٹا سفیان دو برس کا تھا۔ سفیان کا نام ماں نے رکھا تھا۔ سفیان سارا وقت ماں کی گود میں رہتا تھا۔ سفیان گھر میں ہر شخص کو دادی دادی کہہ دیتا تھا۔ میں سفیان کو لے کر ہزاروں میل دور چلا گیا۔

میں نے اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کیا۔ اپنے آپ چلنا سیکھا۔ دنیا سے لڑنا سیکھا۔ اپنا مقام بنایا اور اپنے کارنامے گاہے گاہے ماں کو لکھوا دیتا۔ رابعہ میری ہدایات کے مطابق ماں کو خط لکھا کرتی اور رات سونے سے پہلے مجھے ماں کا خط پڑھ کر سنا دیا کرتی۔ میں ماں کا خط اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنی آنکھوں سے نہیں پڑھتا تھا۔ مجھے ڈر تھا الفاظ کی مچان میں کہیں ماں چھپ کے بیٹھی ہوگی، پھر وہ فلسفیانہ وار مجھ پر کر جائے گی۔

ایک بار میں ایک کام کی غرض سے وطن آیا تھا۔ ایک ہفتہ ماں کے پاس رہا تھا اور ایک بار میں نے رابعہ کو ان کے پاس بھیجا تھا۔ جب وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی، رابعہ تقریباً چھ ماہ ماں کے پاس رہی اور جب ثوبیہ تین ماہ کی ہوگئی تو میں نے اسے واپس بلا لیا۔

زندگی خوب مزے سے گزر رہی تھی۔

زندگی کا ایک چلن بن جائے تو وہ مزے سے گزرتی رہتی ہے۔

ماں مہینے میں ایک خط لکھ دیتی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ ہم لکھیں یا نہ لکھیں۔ اس کا ایک خط آ جایا کرتا تھا۔ خط کا مضمون تقریباً ایک سا ہوتا تھا۔ خیریت کی دعائیں اور ترقی کی تمنا--- ماں کے خط کے مضمون کے ہم اتنے عادی ہو گئے تھے کہ کئی کئی دن ماں کا خط کارنس پر پڑا رہتا۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ کھولتا کیونکہ ہمیں علم تھا کہ اس میں کیا لکھا ہوگا۔ کبھی کبھی رابعہ جواب دے دیتی تھی۔ اب رابعہ بھی بہت مصروف رہتی تھی۔ دونوں بچے بڑے ہو رہے

تھے اور ان پر ہر وقت نظر رکھتی۔

ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں گھر میں داخل ہوا تو رابعہ چلا رہی تھی۔ میں سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا۔ رابعہ لال بھبھوکا چہرہ لیے ایک کتاب کو پھاڑ پھاڑ کر چولہے میں جلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ بکتی جھکتی بھی جاتی۔

میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے، یہ کتاب کیوں جلا رہی ہو؟“

جل کر بیویوں والے انداز میں بولی۔

”کبھی بال بچوں کا تمہیں ہوش ہو تو پتہ چلے کہ صاحبزادے سارا دن کیا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے گندی گندی کتابیں لے آتا ہے اور ساری ساری رات پڑھتا رہتا ہے۔ کئی بار منع کر چکی ہوں، کتابیں چھپا چکی ہوں مگر یہ اور لے آتا ہے۔ ثوبیہ بھی بڑی ہو رہی ہے۔ دونوں کا ایک ہی کمرہ ہے۔ آج میں نے خوب مرمت کر دی ہے اور اب سزا کے طور پر کتاب کو جلا رہی ہوں۔“

میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

دیکھا تو سفیان سیڑھیوں کے نیچے دبکا بیٹھا تھا اور غصے سے شعلہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور باہر نکالا تو وہ چلا چلا کر رونے لگا۔ بازو چھڑانے لگا۔ اس پر غیض و غضب طاری تھا۔ اس نے انگریزی زبان میں اپنی ماں کو گندی گندی گالیاں دیں اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

”پاپا! میں یہ تمہارا ادبیات گھر چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔ اس گھر میں بچوں کو آزادی نہیں دی جاتی۔ بچوں کی نیت پر شک کیا جاتا ہے۔ بچوں پر اپنی مرضی ٹھونسی جاتی ہے۔ تم اور ماما اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔۔۔؟ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے گھر اور تمہاری آسائشوں

پر---!"

میں نے حساب لگایا- اب سفیان تیرہ برس کا تھا- تیرہ برس کا باغی اور ناراض بچہ-

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' اسے کیسے مناؤں- میں نے اکثر اسے رابعہ کے ساتھ الجھتے دیکھا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک گیا ہوگا- وہ غصے میں اپنا بازو چھڑا رہا تھا اور میرے ہاتھ پر مکے مار رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا:

"اگر سفیان مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟"

اس خوف سے مجھے جھرجھری آ گئی مگر امریکہ میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی- یہاں اس عمر میں باغی اولاد ماں باپ کو چھوڑ دیا کرتی ہے- یہاں ماں باپ کو چھوڑ جانا ایک آسان مرحلہ ہے-

اس رات میں ایک پل نہیں سویا- اٹھ اٹھ کر سفیان کے کمرے میں اس کو دیکھتا رہا- رابعہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی-

مگر میں جیسے ہی نیند سے بیدار ہوا-

میں بھی ایسا ہی تھا-

مگر میری ماں نے مجھے کس مہارت سے سدھایا تھا-

یکا یک مجھے زندگی میں اپنی ماں کی ضرورت محسوس ہوئی- وہ ماں جس کا خط پچھلے دس سالوں میں' میں نے نہیں پڑھا تھا' وہ ماں جسے میں نے طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا تھا- وہ ماں جس نے مجھے ایک مضبوط مرد بنایا تھا- میری نازک عمر کو اس طرح سہارا دیا تھا جس طرح تند ہواؤں میں جلتے دیپ کو آنچل کی اوٹ دیتے ہیں-

اگلے دن میں نے وطن واپس آنے کی تیاری شروع کر دی- میں نے دل میں سوچا' میں نے دس بارہ سال ماں کے بغیر جی کے دیکھ لیا ہے- اب ماں کو ہمیشہ کے لیے امریکہ لے

آؤں گا۔ اگر وہ نہ مانی تو سفیان کو ماں کی تحویل میں چھوڑ دوں گا۔

سفیان کو ایک ایسی ہی ماں کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے صرف سفیان کو ساتھ لیا۔ ثوبیہ اور رابعہ کو وہیں چھوڑا اور روانہ ہو گیا۔

آتے وقت میں نے ماں کو اطلاع نہیں دی تھی۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا' ماں کا ایک خط آیا تھا جو کارنس پر پڑا تھا اور جسے کھول کر میں نے پہلی بار پڑھا تھا۔ اس لیے سوچا' اچانک جا کر ماں کو اچانک خوشی دوں' ساری تلافیاں کر دوں' ساری معافیاں مانگ لوں۔

ماں کو محسوس کیا تو ماں دل کے اندر دھڑکنے لگی۔ احساس میں تیرنے لگی۔ جو ایک چالیس سال کا مرد بن چکا تھا۔ پہلی بار اپنی ماں کو محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس کی گود میں لیٹ کے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے نرم اور شفیق چہرے کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دو نیلے ہونٹ جو اکثر میری پیشانی پر ٹک جاتے تھے اور پھر میں یاد کرنے لگا۔ ماں کا انداز گفتگو!

کس طرح ماں چپ چاپ میرے کمرے میں آ کے میرے پلنگ پر بیٹھ جاتی تھی اور کس طرح میں منہ بسور کر پرے سرک جاتا تھا۔ پتہ نہیں اس وقت ماں کیا محسوس کرتی ہو گی۔ میں نے سفیان کے چہرے کی طرف دیکھا' سفیان ابھی تک روٹھا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ بالکل امریکی لڑکوں والا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال۔۔۔ کسی کسائی پینٹ۔۔۔ بشرٹ کے اوپر اوٹ پٹانگ تصویریں' صحت مند سرخ چہرہ۔۔۔ سفیان مجھے بڑا اجنبی لگا۔ اس لڑکے سے بالکل مختلف جسے ماں نے پالا تھا۔

کتنا پیارا تھا وہ بچہ جسے ماں نے پالا تھا اور کیسا تھا یہ بچہ جسے میں پال رہا تھا۔ ماں جوانی کے پہلے عشق کی طرح یکا یک میری زندگی میں آ داخل ہوئی۔ سارے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ یادوں کے مرجھائے ہوئے پتے اس اچانک جھونکے سے ادھر ادھر سر پٹکنے لگے اور میں نے ماں کی تمنا ایک دودھ پیتے

بچے کی طرح کی-

اسی وقت میری ٹیکسی ماں کے گھر کے اندر داخل ہوئی- سامنے کرم دین حقہ پی رہا تھا- کرم دین ہمارا پرانا ملازم تھا- اس نے مجھے گودیوں کھلایا تھا- مجھے دیکھا تو ایک دم کھڑا ہو گیا- ہکا بکا ہو گیا- حقے کی نے پکڑے منہ کھلا چھوڑے سلام کرنا بھول گیا-

”میں نے آگے بڑھ کر کرم دین کا کندھا ہلایا---اور پوچھا:

”اچھے تو ہو کرم دین---؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا- میں نے پھر پوچھا:

”ماں کہاں ہے کرم دین---؟“

کرم دین نے حقہ ایک طرف رکھ دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا- میں گھر کے اندر داخل ہو گیا- چاروں طرف دیکھا، گھر ویسا ہی تھا، صاف ستھرا مگر خاموش-

ماں کے کمرے کو قفل لگا تھا- شاید ہمسائے میں کسی سے ملنے گئی ہوگی- کرم دین نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور ماں کے کمرے کا قفل کھول دیا- میں سفیان کی انگلی پکڑے ہوئے اندر داخل ہو گیا- تخت پر جائے نماز بچھی تھی- اس کا ایک کونہ الٹا ہوا تھا اور اس کے سرہانے ایک لکڑی کا صندوق پڑا تھا- کرم دین نے پہلے ساری کھڑکیاں کھول دیں- بتیاں جلا دیں اور پھر آگے بڑھ کے لکڑی کے صندوق کا ڈھکن اٹھا دیا- اسی وقت ایک تیز جھونکا کمرے کے اندر آیا اور لکڑی کے صندوق میں رکھے ہوئے بے شمار بند لفافے ایک ایک کر کے یوں باہر نکلنے لگے جیسے شریر بچے کلاس سے باہر آتے ہیں-

”صاحب جی!“ کرم دین آہستہ سے بولا-

”ان کو گئے تو دو سال ہو گئے جی---“

”اور تم نے ہمیں نہیں بتایا-“ میں گرجا-

''صاحب جی! ان کا حکم ایسا تھا- آخری دو سال بہت بیمار رہیں- ان کی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف ہو گئی تھی- دن رات اسی تخت پر لیٹی رہتی تھیں اور دن رات خط لکھتی رہتی تھیں- لفافے پر آپ کا پتہ لکھتیں اور خط اس صندوق میں رکھ دیتیں- جانے سے ایک روز قبل مجھے بلایا اور کہنے لگیں:

''کرم دین! آج وصیت کرنے کا دن آ گیا ہے- میرے جانے کے بعد تمہارا فرض ہو گا' ہر مہینے ان خطوط میں ایک خط اٹھا کر اس پر ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دیا کرنا- ہاں جس دن پوسٹ کرو' اس دن کی تاریخ لفافے پر ضرور لکھ دینا- جب تک یہ لفافے ختم نہ ہو جائیں' تم اس گھر میں رہنا- اچھو کو ابھی پتہ نہیں لگنا چاہیے- اس وقت وہ دنیا میں سر اٹھا کے جی رہا ہے- میں جانتی ہوں جب اسے اندازہ ہو گا' اس کی ماں نہیں رہی تو اس کا اٹھا ہوا سر جھک جائے گا- ابھی اسے پتہ نہیں لگنا چاہیے- ابھی میرے بیٹے کو اپنی دنیا میں مگن اور مطمئن رہنا چاہیے-''

''صاحب جی! انہوں نے بنک میں رقم چھوڑی ہے اور میں ان کی ہدایات کے مطابق ہر ماہ اپنی تنخواہ وہاں سے لے لیتا ہوں-''

''صاحب جی! وصیت کا تو احترام کرنا چاہیے- ابھی تو صرف دو سال ہوئے ہیں' لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے اگلے دس سالوں کے لیے وہ خط لکھ کے اس صندوق میں رکھ گئی ہوں- انہوں نے کہا تھا جب خط ختم ہو جائیں' تب آپ کو اطلاع کر دی جائے- صاحب جی! خط ختم ہوتے تو میں آپ کو اطلاع دیتا صاحب جی--- مجھے کیا معلوم تھا' آپ اچانک آ جائیں گے صاحب جی---''

پتہ نہیں کرم دین کیا کیا کہہ رہا تھا--- میں اپنا سر تھام کے لکڑی کے اس صندوق کے قریب بیٹھ گیا جیسے وہ میری ماں ہے اور آج میں تھکا ہارا اس کی گود میں پناہ لینے آ پہنچا ہوں-

اسی وقت باہر نہ جانے کیسے موسم تبدیل ہو گیا تو ہوا کے زور آور جھکڑ دروازے توڑ توڑ کے اندر آنے لگے-

ہوا کے زور پر سارے لفافے اڑ اڑ کر میرے ارد گرد یوں گھومنے لگے جیسے میرا طواف کر رہے ہوں- سفیان آگے بڑھ کر سارے لفافے اکٹھے کرتا اور میرے آگے تخت پر رکھ دیتا- ہوا اتنے زور سے چل رہی تھی کہ لفافے بار بار بکھر جاتے-

بکھر جاتے تھے' بے تاب ہو کر اٹھتے تھے اور مجھ سے لپٹ جاتے تھے- کوئی میرے چہرے پر آ کر لگتا' کوئی میرے سینے سے' کوئی میرے پہلو سے- کوئی میرے بازوؤں سے-

سب خط ادھر ادھر بے تابانہ انداز میں ناچ رہے تھے جیسے برہا کی ماری ماں کا بچہ ایک عمر کے بعد گھر آتا ہے تو وہ بھاگی بھاگی پھرتی ہے' اپنی خوشی چھپا نہیں سکتی--- سفیان دیوانہ وار خطوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے-

یہ اکٹھے کرتا ہے-

وہ بکھر جاتے ہیں-

میں پتھر بنا بیٹھا یہ کھیل دیکھ رہا ہوں-

ایک آنسو بھی میری آنکھ سے نہیں ٹپکا-

ایک شکوہ بھی تو میں نے اپنی زبان سے نہیں کیا-

خطوں کو دیکھ رہا ہوں-

ان خطوں کے اندر ہنستے مسکراتے لفظوں کو دیکھ رہا ہوں- اک اک لفظ دیئے کا روپ دھار رہا ہے-

اک اک لفظ جگمگا رہا ہے-

ماں کے سارے زندہ فلسفے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں-

وہ مضبوط اور آہنی ستون جس کے سہارے میں نے زندگی کے چالیس برس بتائے تھے- دھڑام سے نیچے آ رہا ہے-

میں اپاہج بنا بیٹھا ہوں-

پل میں تھک کر چور ہو گیا ہوں-

اپنی سانسوں سے اس گھر میں گزارا ہوا ایک ایک پل چن رہا ہوں-

خط میری بلائیں لے رہے ہیں-

خط میرے اردگرد ناچ ناچ کر خوشیاں منا رہے ہیں-

خط پورے کمرے میں کودے پھرتے ہیں-

خط مجھے سہارا دے رہے ہیں- میرا ہاتھ پکڑ رہے ہیں- مجھے کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں--- تیز جھکڑ تو بس ایک بہانہ ہیں- اندر کا موسم بدلے تو باہر بھی آندھیاں اٹھنے لگتی ہیں--- سفیان بار بار خطوں کو جمع کر کے میرے سامنے ڈھیر کرتا ہے- خط بار بار اڑ جاتے ہیں-

میں کہنا چاہتا ہوں: ''رہنے دو سفیان--- یہ ماں بیٹے کا کھیل ہے-''

''ماں بیٹا جو ساری زندگی آگے پیچھے دوڑتے رہے---'' مگر میری قوت گویائی سلب ہو گئی ہے-

ماں تو میری بولنے کی طاقت بھی لے گئی-

بیگم صاحبہ

(ناولٹ)

سرمدی صاحب شام کی میٹنگ اٹینڈ کر کے جونہی گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ان کی نظر برآمدے میں کھیلتے محمد شعیب پر پڑ گئی۔ اویس کے صاف ستھرے کپڑے پہنے کنگھی سے بال جمائے وہ ان کے تینوں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا بلکہ گیلویسٹ سے یوں ایک بڑی عمارت بنا رہا تھا جیسے وہ جنم جنم سے ان چیزوں سے کھیلنے کا عادی ہو اور کسی ماہر فن تعمیر کا بیٹا ہو، اور ان کے تینوں بچے کرن، کنول اور ننھا اویس یوں محویت سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ سرمدی صاحب کے نہیں کوارٹروں کے بچے ہوں۔ سرمدی صاحب کو ایک دم غصہ آ گیا۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ان کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ بچوں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔۔۔ تو ۔۔۔ ''ابو آ گئے، ابو آ گئے۔'' کہہ کر ان سے لپٹ گئے، مگر انہوں نے روز والی خوش دلی سے بچوں کو نہیں پکارا بلکہ جھٹکا دے کر نکل گئے اور اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ وہاں کر انہوں نے ہادیہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ سرمدی صاحب کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی کہ گھر میں کوئی بات اپنی مرضی کے خلاف دیکھتے تو اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیتے۔ ہادیہ ان کی نبض شناس ہو گئی تھی۔ اس لیے ان کے چیخنے چلانے کی وجہ دریافت کرتے اسے دیر نہ لگی۔

''ہادیہ۔۔۔ ہادیہ۔۔۔'' جب وہ زور زور سے چلائے تو وہ دوڑی آئی، ان کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑ لیا۔ وہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہادیہ منتظر تھی

اور ان کے غصے کی وجہ جان گئی تھی۔ اس لیے چپ چاپ کھڑی رہی تو وہ اس کی طرف تحیر کی نگاہ سے دیکھ کر بولے۔

''یہ لڑکا ابھی تک یہاں ہے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیوں۔۔۔؟'' وہ غرا کر کھڑے ہو گئے۔ ''اس کو دفعان کیوں نہ کیا تم نے۔''

ہادیہ چپ کھڑی رہی۔

''ضروری نہیں کہ آدمی اپنی بے وقوفی کا عملی ثبوت بھی دے۔۔۔ اور نقصان اٹھائے۔۔۔ جہاں سے اسے لائی ہو۔ وہیں جا کر چھوڑ آؤ۔''

''یعنی اسے بے دردی سے سڑک پر جا کر چھوڑ آؤں۔'' ہادیہ نے بے چینی سے کہا۔ کل تک وہ سڑکوں پر ہی تو پھرتا تھا، کہیں اپنا ٹھکانہ کر لیتا۔

''بہت چھوٹا ہے، ممکن ہے غلط لوگوں کے ہاتھ لگ جائے۔''

''اور اگر اس کے ذریعے غلط لوگوں کے ہاتھ تمہی لگ گئے تو۔۔۔؟''

''ہمیشہ ہر ایک سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔''

''ہاں..... اگر ایسا ممکن ہوتا تو یہ دنیا آج جنت ہوتی..... کاش صرف تم جیسے بے وقوف ہی اس دنیا میں ہوتے۔۔۔!''

ہادیہ کو ان سے اس فقرے سے بہت دکھ پہنچا، جانے یہ مرد لوگ غصے میں ہمیشہ اپنی بیویوں کو احمق اور بے وقوف کیوں کہتے ہیں۔ دنیا بھر کی حماقتیں خود ان سے سرزد ہوتی ہیں۔ مگر..... جب بھی بولیں گے۔ دل چیر کے رکھ دیں گے۔ اک ذرا سی بات پر محبت کے رشتے کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔ آخر عورتیں ان مردوں کے لیے کیا کیا نہیں کرتیں۔

بات اتنی سی تھی۔ کل جب بیگم ہادیہ سرمدی اپنے بچوں کو لینے سکول گئیں تو ایک بچہ

سکول کے گیٹ کے باہر کھڑا رو رہا تھا- انہوں نے چوکیدار سے پوچھا---

کہ یہ کس کا بچہ ہے---؟

چوکیدار بولا-

''خو بیگم صاحب! ام تو نہیں جانتا- صبح یہ بچہ روتا ہوا آیا تھا اور اس گیٹ پر کھڑا ہو گیا- بولا میرے ماں باپ نئیں ہیں- ام نے تو بہتیرا پوچھا...... جس کا بچہ ہو گا' وہ آ کر لے جائے گا---''

ہادیہ کو ایک دم اس بچے پر ترس آ گیا- موٹر سے باہر نکل کر اس نے بچے کو اپنے پاس بلایا چمکارا- اس کے آنسو پونچھے--- پھر اس کا نام پوچھا---

بچہ صاف آواز میں بولا-

''میرا نام محمد شعیب ہے-''

''آپ کی امی ابو کہاں ہیں بیٹا......''

بچے کی عمر تقریباً سات آٹھ برس کی ہو گی روتے ہوئے بولا-

''میرے امی ابو اللہ کے پاس چلے گئے ہیں-''

''آپ کو یہ کس نے بتایا---؟''

''میرے ایک چچا نے بتایا ہے-''

''وہ کہاں ہیں---؟''

''پتہ نہیں......''

''آپ نے اپنے امی ابو کو دیکھا تھا-''

''جی ہاں---!''

''اب دیکھو تو پہچان لو گے---''

''جی ہاں......''

''چلو ہم تلاش کر دیں گے آپ کے امی ابو کو---''

ہادیہ نے چمکار کر اسے موٹر میں بٹھا لیا پھر سکول کے چوکیدار کو اپنے گھر کا پتہ لکھ کر دے دیا......اور اس سے کہا کہ اگر کوئی اس بچے کو لینے آئے تو اسے ان کے گھر بھیج دیا جائے-

راستہ بھر وہ بچے کو چمکار کر اس سے مختلف قسم کے سوال کرتی رہیں--جس سے ان کو یہ اندازہ ہوا کہ بچے کے والدین بس کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے اور اسی حادثے میں بچ جانے والا ایک شخص اسے اپنے گھر لے گیا تھا مگر کچھ دنوں بعد اس نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا تھا- بہر حال--- ہادیہ نے دل میں سوچا--- کہ وہ جلدی اس حادثے کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس بچنے والے آدمی کو تلاش کرلے گی- اور اس سے پتہ چل جائے گا کہ اس کے والدین کون تھے- واقعی مر چکے یا زندہ ہیں- اگر وہ زندہ نہیں تو اس یتیم و یسیر بچے کو وہ پال لے گی- یہ بچہ اس کے اویس کی عمر کا ہی لگتا تھا- ہادیہ کی بڑی بیٹی کرن دس سال کی تھی- اویس آٹھ سال کا تھا......اور ننھی کنول چار برس کی تھی-

گھر آ کر اس نے یہ بات سرمدی صاحب کو بتا دی- بجائے خوش ہونے کے وہ اسے ڈانٹنے لگے- انہوں نے اس کو احمقانہ فعل قرار دیا- ان کا خیال تھا' اس بچے کی وجہ سے ہادیہ عنقریب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی- ہو سکتا ہے بچہ کسی جرائم پیشہ گروہ کا شکار ہو- وہ بھی ٹھیک کہتے تھے- آئے دن ایسے عجیب و غریب واقعات سننے میں آتے ہیں کہ انسانوں کا انسانیت پر سے اعتبار اٹھتا جا رہا ہے-

پھر بھی جانے کیوں--- ہادیہ جب بھی اس معصوم بچے کا چہرہ دیکھتی' اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا-

کل رات سونے سے پہلے سرمدی صاحب نے ہادیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا

کہ ''صبح جب بچوں کو سکول چھوڑنے جاؤ تو اسے وہیں گیٹ پر چھوڑ آنا---''

لیکن ہادیہ کا دل نہ مانا---بچہ خواہ کسی جرائم پیشہ گروہ کا فرد ہی کیوں نہ ہو---اس میں اس کا قصور تھا---؟ اسے ان لوگوں سے بچا لینا بھی تو ہمارا فرض ہے---ابھی معصوم ہے---ملوث نہیں ہوا---اگر واقعی لاوارث ہے تو وہاں گیٹ پر کھڑا کھڑا اٹھٹھر جائے گا۔ مر جائے گا۔ سکول میں ہزاروں والدین اپنے بچوں کو لینے آتے ہیں۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ غالباً بچے کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہاں چلا جائے اور ماؤں اور باپوں کے محبت بھرے دلوں سے بھیک مانگے---شاید کوئی اسے کلیجے سے لگا کر گھر لے جائے---اپنے بچوں کے صدقے میں......

نہیں نہیں...... ہادیہ کانپ گئی......

''میں اسے وہاں ہرگز چھوڑ کر نہیں آؤں گی---''

لیکن سرمدی صاحب اس لیے سیخ پا ہو رہے تھے کہ ہادیہ نے گھر میں کبھی ان کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی، ان کی ہر بات کو حکم کا درجہ دیتی تھی۔ آج ایک لاوارث لڑکے کی خاطر وہ حکم عدولی کر رہی تھی۔

نہ صرف یہ کہ کل شام سے اسے گھر رکھا ہوا تھا بلکہ آج نہلا دھلا کر اسے اویس کے صاف ستھرے کپڑے بھی پہنا دیئے تھے اور وہ یوں راجہ بنا ان کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جیسے اس نے اسی گھر میں جنم لیا ہو۔

''صبح ہونے سے پہلے اس لڑکے کو دفعان کر دو۔ ورنہ میں خود اسے مار مار کر نکال دوں گا---''

''ہائے اتنی سردی میں---''

''تو اسے گرم کپڑے پہنا دو۔ ایک بستر بھی دے دو اور کچھ نقدی بھی دے دو---''

''مگر وہ جائے گا کہاں---؟''

''جہنم میں چلا جائے---میں کسی نیچ کے بچے کو اپنے بچوں کے ساتھ نہیں رکھوں گا- میرے بچوں پر اس کی صحبت کا برا اثر ہوگا---غضب خدا کا---گھر میں دو لڑکیاں بھی ہیں---''

ہادیہ خاموشی سے باہر نکل گئی-

اور جا کر کونے میں پڑے ایک سٹول پر بیٹھ گئی- بچے وہاں کھیل رہے تھے---

شعیب کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا- بار بار---اویس کو مخاطب کرتا اور ہر بار بڑے میٹھے لہجے میں کہتا- اویس بھائی---اویس بھائی---!

اچانک اویس بولا-

''شعیب کل سے تم ہمارے سکول جاؤ گے نا---؟''

''ہاں......'' پھر وہ ایک دم رک کر بولا---''پتہ نہیں...... پتہ نہیں مجھے کوئی بھیجے گا یا نہیں-''

''نہیں......امی نے کہا ہے......وہ تمہیں بھی ہمارے سکول میں داخل کرا دیں گی-کل پرنسپل صاحب کے گھر بات کرنے جائیں گی-''

''اچھا-'' شعیب کی آنکھوں میں ایک روشنی لہرائی- پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ روشنی بجھ گئی---!

ہادیہ کے دل میں درد سا اٹھا---

اسی وقت اویس کی نظر اس پر پڑ گئی---

دوڑ کر آیا اور بولا-''امی امی......کل شعیب ہمارے ساتھ سکول جائے گا' نا---؟''

ہادیہ خاموشی سے بیٹھی رہی...... جب اویس نے اسے بہت جھنجوڑا- تو آنسو کا ایک

قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ اسے اپنی ہتھیلی سے صاف کر کے ہادیہ جلدی سے بولی۔

''ہم اس کا اچھا سا بندوبست کریں گے اویس۔۔۔''

ننھے شعیب کو، کہ منتظر اور ملتجی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس فقرے کی سمجھ نہیں آئی۔۔۔ مگر اویس مطمئن ہو کر چلا گیا۔

☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ سرمدی صاحب کی آنکھ کھل گئی...... دل پر دباؤ سا پڑ رہا تھا اور پیشانی پر پسینہ نمودار ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گئے۔ سائیڈ ٹیبل پر بڑا لمپ جلدی سے جلا دیا اور اپنی نبض دیکھنے لگے۔ نبض تو ٹھیک تھی مگر دل خوف کے مارے دھڑک رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے اب تو جس آدمی کا دل ذرا زور سے دھڑکے، اسی کو ہارٹ اٹیک کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سرمدی صاحب کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ ہاں کچھ عرصہ سے انہیں گیسز کی تکلیف ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ رات کو پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ جس روز بھی کسی دعوت پر مرغن غذائیں کھا لیتے تھے، رات بھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔ ابھی ان کی عمر صرف بیالیس برس تھی۔۔۔ مگر انہوں نے چونکہ زندگی میں بے حد محنت کی تھی، اس لیے اپنی عمر سے بڑے لگتے تھے۔ ان کی سائیڈ ٹیبل پر ہمیشہ ہاضمے کی چورن اور ایلکا سیلرز کی ڈبیا رکھی رہتی تھی۔ ہادیہ ہر روز رات کو اہتمام سے ان کی سب دوائیں ان کے پاس رکھتی تھی۔ کئی بار رات کو اٹھ کر وہ تازہ پانی کے گلاس میں ایکا سیلزر کی ایک ٹکیہ ڈال کر پی لیتے تھے۔۔۔ اسی وقت طبیعت کی گرانی دور ہو جاتی تھی۔

آج بھی انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔۔۔ سب کچھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ حتیٰ کہ پانی کا گلاس بھی پڑا تھا مگر ہادیہ اس کمرے میں موجود نہ تھی۔

غالباً آج ہادیہ ان کے کمرے میں نہیں سوئی تھی۔

رات سونے سے پہلے انہوں نے اس کے ساتھ تلخ کلامی کی تھی، شاید برا مان گئی--- وہ سرمدی صاحب کے سامنے زبان نہیں چلاتی تھی- اگر ان کی کوئی بات بری لگ جاتی تو اپنی برہمی کا ظاہر کرنے کے لیے وہ اس رات بچوں کے کمرے میں سو جاتی تھی- اگلے روز سرمدی صاحب اسے منا لیتے تھے کیونکہ دونوں میاں بیوی میں ایک مثالی محبت تھی- اپنی تمام تر کرختگی کے باوجود سرمدی صاحب رات کو اپنے پلنگ پر اپنی بیوی کے بغیر نہیں سو سکتے تھے اور شاید ان کی اس کمزوری سے ہادیہ واقف تھی- اسی لیے تو اس انداز میں روٹھ جاتی تھی تاکہ وہ اسے جلدی سے منالیں---!

سرمدی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا، غسل خانے سے تازہ پانی لائے اور اس میں ایکا سیلرز کی ٹکیہ ڈال کر صوفے پر بیٹھ گئے-

آج انہیں بھی ہادیہ کے اس طرح روٹھ کر دوسرے کمرے میں سونے پر غصہ تھا- یہ اصول کی بات تھی، غصہ کرنے کی بات نہیں تھی- وہ اس گھر کے مالک ہیں اور اس گھر کی فلاح کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے کے مجاز ہیں- ہادیہ کی یہ ضد بے معنی تھی اور وہ کبھی اس لفنگے لڑکے کو اپنے گھر میں گوارا نہ کریں گے-

ایکا سیلرز کی ٹکیہ گلاس میں غل مچا کے، خاموش ہو گئی تھی اور اب سوڈے کی بوتل کی طرح ننھے ننھے ذرے ادھر ادھر پانی میں بن کے ڈوب رہے تھے-

سرمدی صاحب تھوڑی دیر تک گلاس کے اندر پانی کے مچلتے ہوئے ذرے دیکھتے رہے اور جب ذرے بجھ بجھ کر پانی میں تحلیل ہونے لگے تو انہوں نے گلاس اٹھا کر منہ کے ساتھ لگا لیا-

اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگے-

کچھ دیر ٹہلنے کے بعد معدے کی تبخیر ڈکار کی صورت میں خارج ہوئی تو ان کی طبیعت کی

گرانی دور ہوگئی اور وہ پھر آ کر اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

رات کا سناٹا کتنا عجیب لگتا ہے؟ انہوں نے سوچا --- کوئی آواز نہیں، کوئی آہٹ نہیں۔ یوں جیسے رات نے چپ کی چادر اوڑھ لی ہو --- مگر پھر بھی کتنی نہ معلوم سی آوازیں ہیں۔ مگر ان آوازوں کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا --- انہی آوازوں میں بعض اوقات اپنے دل کی دھک دھک، اور نبض کی ٹک ٹک بھی شامل ہو جاتی ہے...... حتیٰ کہ اپنی سانس کی بھبھک بھی کتنی اجنبی اور نامانوس لگتی ہے اور یہی رات ہے جسے ہمیشہ سو کر گزار دیا جاتا ہے --- اور پتہ بھی نہیں چلتا --- اور پھر رات کتنی خوف ناک اور بھیانک بن جاتی ہے اگر انسان تنہا ہو --- جینے کے لیے دوائی کا احساس کتنا ضروری ہے ---؟

انہوں نے پھر ہادیہ کو یاد کیا --- بلکہ ان کا دل چاہا کہ لپک کر جائیں اور اسے بلا لائیں، صبح کا انتظار نہ کریں۔ اسے منا لیں --- اس سانس کا کیا بھروسہ --- جانے صبح تک کیا ہو جائے...... ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے --- حالانکہ اب سینے کی جلن اور دباؤ میں افاقہ تھا مگر...... خوف دور نہیں ہوا تھا...... جانے یہ موت کا خوف ہمیشہ رات کے سنسان لمحوں میں کیوں اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے؟

غالب نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ

موت کا ایک دن معین ہے؟
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ---؟

آج ہی انہیں اس شعر کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آیا تھا...... پھر انہیں ہادیہ پر غصہ آنے لگا۔ انہوں نے اسے منانے کا خیال چھوڑ دیا...... محض ایک واہیات سے لڑکے کی خاطر ان سے ناراض ہوگئی تھی۔

انہوں نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اور چت لیٹ گئے......

جب طبیعت کو قدرے سکون ملا تو اٹھ کر نیند کی گولی کھالی۔ پھر گولی کے فوراً بعد کون سا نیند آ جاتی ہے۔ وہ چھت پر دیکھنے لگے۔ اس زمانے میں چھتوں کی کڑیاں نہیں ہوتیں کہ آدمی کڑیاں گنتا ہوا سو جائے--- تب انہیں خیال آیا کہ کڑیاں تو واقعات اور حادثات کی بھی ہوتی ہیں۔ زندگی کی بھی ہوتی ہیں، ان کو ملانے سے وہی نتیجہ برآمد ہوگا--- ذہن مصروف ہوگا تو نیند آ جائے گی۔

اپنی مصروف تر زندگی پر انہوں نے نظر ڈالی۔

مشین کی طرح وہ زندگی کے ساتھ نبرد آزما تھے اور یہی مصروف زندگی انہوں نے ہاتھ پھیلا کے مانگی تھی۔ بڑا سا دفتر، بے شمار کام--- سال میں دو تین مرتبہ غیر ملکی دوروں پر جانا--- بیانات جاری کرنا--- اخباروں کی زینت بننا--- واقعی وہ ایک بڑے آدمی بن گئے تھے۔

انہوں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر باہر نکالی اور سوچا--- کون کہتا ہے انسان کی تقدیر اس کی مٹھی میں نہیں ہوتی۔ انہوں نے تو جو سوچا، وہ بن کر دکھا دیا---

لیکن کیا تم سچ کہہ رہے ہو---؟ تم نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے---؟

نہیں نہیں...... وہ ایک دم لرز اٹھے۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ بے شک پروردگار کی مدد کے بغیر میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا---!

انہوں نے تصور ہی تصور میں اپنے سر کو اللہ کے حضور خم کیا۔ جیسے اس کا شکریہ ادا کیا ہو کہ اس نے انہیں فرش سے عرش پر لا کر کھڑا کیا تھا۔

اور پھر سوچتے سوچتے وہ اپنی زندگی کے پچھواڑے گئے...... ان کے سامنے کئی چہرے آئے اور گزر گئے...... ساری انسانی زندگی چہروں کی کہانی ہوتی ہے--- مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھیں تو قطار اندر قطار یادوں کے جگنو مہکتے نظر آتے ہیں...... یہ جگنو وہ چہرے ہوتے

ہیں جو سدا کو یادوں کی بساط پر رہ جاتے ہیں- اچھے چہرے، برے چہرے...... وہ چہرے جنہوں نے دکھ دیئے- کرب بخشے اور زندگی کو عذاب دیئے، وہ بہت جلد ڈوب جاتے ہیں مگر ایسے چہرے جنہوں نے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں آگے بڑھ کر ہاتھ تھاما--- وہ ذہن کے افق پر ستارے بن کر رہ جاتے ہیں...... یہ سب چہرے وسیلے ہوتے ہیں......

ان کے ذہن میں یکے بعد دیگرے کئی چہرے ابھرے، ڈوبے--- اماں--- ابا--- بہن بھائی--- دوست، ہمسائے--- وہی گلیاں، کوچے، بازار--- وہی زمانہ---

تب ایک دم ایک موٹر- ایک دلخراش چیخ کے ساتھ ان کے دل کے آس پاس آ کر رک گئی- ان کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ موٹر ان کے سینے پر چڑھ آئی ہو- اور اس کے وزن کے احساس سے ان کی سانس سینے میں گھٹ رہی ہے--- وہ گھبرا کر بیٹھ گئے-

ان کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوگئی- جیسے میلوں سے بھاگتے چلے آ رہے ہوں......

☆

سخت سردی کا موسم تھا- گلبہار کالونی کی مین روڈ پر بچوں کے چار سکول تھے- دو سکول لڑکیوں کے اور دو لڑکوں کے--- ایک انگلش میڈیم ہائی سکول لڑکوں کا تھا اور ایک اردو میڈیم ہائی سکول نچلے طبقے کے غریب بچوں کے لیے اسی سڑک پر تھا- ان کے پاس مکمل فرنیچر نہیں تھا- اس لیے اکثر بچے زمین پر ٹاٹوں کے اوپر بیٹھتے تھے--- سڑک کی دوسری طرف دو سکول لڑکیوں کے لیے تھے، ایک ہائی اور دوسرا پرائمری- رفیقہ بیگم ہر روز صبح اپنی دونوں بچیوں کو سکول چھوڑنے جایا کرتی تھیں- اس روز موسم ابر آلو تھا اور صبح آٹھ بجے سڑکوں پر سخت دھند تھی، لیکن موٹریں، سائیکلیں اور سکوٹر بچوں کو لے کر سکول کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے- امیر بچے گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے جب کہ غریب بچے ایک سویٹر اور ٹھنڈی پتلون میں سکڑتے سمٹتے چلے جا رہے تھے......

ایک دم ان کی موٹر ایک بچے سے ٹکرائی۔ ڈرائیور نے بریک لگائی۔۔۔ لڑکا دور جا گرا، اور اس کی کتابیں سڑک پر بکھر گئیں۔ سراسر اس لڑکے کا قصور تھا۔ اتنے چالو ٹریفک میں سڑک پار کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم موٹر کے آگے آ گیا تھا۔

مگر رفیقہ بیگم کی تو چیخ نکل گئی۔ جونہی دھچکا کھا کر موٹر رکی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئیں۔ دوسری طرف سے ڈرائیور بھی نکل آیا۔ لڑکا کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ ڈرائیور بڑبڑاتا ہوا اس کی کتابیں اکٹھی کرنے لگا۔

”بیٹے کہیں چوٹ تو نہیں آئی“ رفیقہ بیگم نے بڑے دلار سے پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔!“ لڑکا بڑی کرختگی سے بولا اور ڈرائیور کے ہاتھ سے جھپٹ کر کتابیں لے لیں۔ ”آپ اپنی موٹر کی خبر لیں، کہیں اس کو تو خراش نہیں آ گئی۔“

”دیکھو بیٹا، صبح کے وقت احتیاط سے چلتے ہیں۔ سب کو سکول جانے کی جلدی ہوتی ہے۔“

رفیقہ بیگم نے دیکھا۔ لڑکا غریب تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی ٹھنڈی پتلون پہن رکھی تھی اور ایک چھوٹا سا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ اس کے جوتے بھی پھٹے ہوئے تھے۔

رفیقہ بیگم نے جلدی سے پرس کھولا اور سو کا نوٹ نکال کر لڑکے کی طرف بڑھایا۔

اس نے بڑی کراہیت سے نوٹ کو دیکھا اور پھر ان کے ہاتھ سے لے کر سڑک کی طرف اچھال دیا اور غصے کو ضبط کیے بغیر بولا۔

”بیگم صاحبہ! میں کوئی بھیک منگا نہیں ہوں اور مجھے کوئی چوٹ بھی نہیں آئی، پھر آپ اس سرخ نوٹ سے میرا منہ کیوں بند کرنا چاہتی ہیں جب کہ آپ کا ڈرائیور مسلسل بڑبڑا رہا ہے کہ یہ حادثہ میری وجہ سے ہوا۔ ہاں اگر حادثہ مکمل ہو جاتا۔۔۔ مجھے کچھ ہو جاتا تو پھر بہت سے پیسے دے کر میرے والدین کو خریدنے میں حق بجانب تھیں۔“

''بیٹے میں بہت شرمندہ ہوں۔ بچے سب بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ امیروں کے ہوں یا غریبوں کے۔''

''خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتی۔ میں نے تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر پیسے دیئے ہیں، بھیک نہیں دی۔'' ڈرائیور نوٹ اٹھا لایا تھا اور اب اس نے بیگم صاحبہ کو پکڑا دیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے بڑی ندامت سے وہ نوٹ واپس لے لیا اور پرس میں رکھ لیا، اور بولیں۔

''بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟''

''غیور احمد!'' لڑکا تنا تنا سا بولا۔

''بہت موزوں نام ہے۔''

''کس کلام میں پڑھتے ہو؟''

''نویں میں---!''

وہ اسی انداز میں بولا---

''یہ سامنے ماڈل ہائی سکول میں پڑھتے ہو۔''

''جی ہاں۔ وہ تلخی سے بولا۔ اس محلے میں یہی غریبوں کا سکول ہے۔''

''آپ کے والد کیا کرتے ہیں بیٹا؟''

بیگم صاحبہ نے بڑی لجاجت سے دوبارہ پوچھا......

''جی---میرے والد کوئی سرکاری افسر نہیں ہیں۔ وہ اپنے اسی تلخ انداز میں بولا۔

''درزیوں کا کام کرتے ہیں۔ اس کالونی میں انہوں نے کرائے کا ایک کوارٹر لے چھوڑا ہے۔ دن کو وہاں کپڑے سیتے ہیں اور رات کو مشین سمیٹ کر ہم وہاں سو جاتے ہیں اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو۔''

لڑکا بدتمیزی سے بولا۔

''نہیں میرے بچے۔'' وہ جلدی سے بولیں---

مگر جانے کیوں انہوں نے اس بچے کو روک رکھا تھا' جو اتنی سخت سردی میں کھڑا ان کے سامنے غرا رہا تھا اور اس کے منہ سے دھوئیں کے بادل اس طرح نکل رہے تھے کہ جیسے وہ گولہ بارود سے واقعی حملہ کرنا چاہتا ہو---

انہوں نے اس کی شکل کو غور سے دیکھا' اس کے کپڑوں کو دیکھا--- اس کے پھٹے ہوئے جوتوں کو دیکھا۔

تو جانے کیوں بیگم صاحبہ کا دل کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ ان کی بچیاں بنیان سے لے کر کوٹ تک ولایتی گرم کپڑوں میں ملبوس تھیں جب کہ درزی کا یہ بیٹا نامکمل سرد کپڑوں میں۔ لوہے کی ایک ٹھنڈی دیوار بنا کھڑا تھا--- پتہ نہیں ان کا دل کیا چاہنے لگا۔

مگر انہوں نے اردگرد دیکھا---

انہوں نے اچھا خاصا ٹریفک روک رکھا تھا' بلکہ سڑک پر بدمزگی پھیلا دی تھی۔

جن کو جلدی تھی' وہ ادھر ادھر سے گاڑیاں موڑ کر نکل رہے تھے۔

کچھ لوگ انہیں غصے سے گھور رہے تھے۔

ڈرائیور الگ بڑبڑا رہا تھا---

انہوں نے جلدی سے اپنا پرس بند کیا اور بولیں۔

''اچھا بیٹا جاؤ--- تمہیں دیر ہو رہی ہے۔''

بیگم صاحبہ نے اسے بہت سی دعائیں دیں مگر دعاؤں سے بے نیاز وہ لڑکا الجھا الجھا' تنا تنا سا--- اور خفا خفا سا--- سڑک کے اس پار نکل گیا۔ بیگم صاحبہ آ کے موٹر میں بیٹھ گئیں۔ اور حسب معمول ڈرائیور کو ڈانٹنے لگیں۔

''ڈرائیور! میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے' احتیاط سے موٹر چلایا کرو۔''

''جی میں تو احتیاط سے ہی چلاتا ہوں۔'' وہ رعونت سے بولا۔ یہ آج کل کے لڑکے ہی سڑکوں پر اندھے ہو کر چلتے ہیں۔''

بکواس بند کرو!'' بیگم صاحبہ گرجیں۔ کسی کے بچوں کو کچھ کہنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔۔۔

''جی ہاں۔'' ڈرائیور غصے سے دانت بھینچ کر بولا۔ چاہے وہ غلط جگہ سے چالو ٹریفک میں سڑک پار کرنے کی کوشش کریں، غلطی ہمیشہ ڈرائیور کی ہوگی۔''

''ہاں۔'' بیگم صاحبہ نے بھی غصہ سے کہا۔

''تمہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس سڑک پر بچوں کے سکول ہیں۔ سکولوں والی سڑک سے گزرتے وقت ہر موٹر والے کو بہت آہستہ اور بہت محتاط ہونا چاہیے۔ بچوں کو تو جلدی ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچے جذباتی بھی ہوتے ہیں' دوڑ کر پار کرنے کا رسک لیتے ہیں۔ ہر موٹر چلانے والے کے ذہن میں یہ بات ہونی چاہیے کہ سکول کے نزدیک پیدل چل کر آنے والے بچوں کو پہلے سڑک پار کرنے کا حق دیا جائے گا۔''

''ہاں جی۔'' ڈرائیور طنز سے بولا۔ ''اس طرح تو پھر ہر موٹر والا شام تک ضرور اپنے بچوں کو سکول میں چھوڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''ذرا شعور کی ضرورت ہے ڈرائیور اور تم کو چونکہ لائسنس مل چکا ہے' اس لیے تم اپنے آپ کو سڑکوں کا بادشاہ سمجھنے لگے ہو۔ اس بات کا خیال رکھو گے؟''

ڈرائیور خاموش ہو گیا۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کافی گستاخی کر چکا ہے۔

بیگم صاحبہ کی عادت تھی کہ موٹر میں بیٹھتے ہی ڈرائیور کو ہدایات ضرور دیتی تھیں۔ خصوصاً

جب موٹر کسی سکول کے آگے سے گزرتی تو بیگم صاحبہ کی ممتا چھلک چھلک کر باہر ٹپکنے لگتی۔

''احتیاط سے چلنا ڈرائیور۔۔۔!''

''وہ دیکھو سامنے ایک ننھا سا بچہ آ رہا ہے۔ اس کو سڑک پار کر لینے دو۔''

''ہارن دو! وہ دونوں لڑکے بے خبر جا رہے ہیں۔''

''گرد مت اڑاؤ!''

''بچوں پر پانی کے چھینٹے مت پھینکو، ان کا یونیفارم خراب ہو جائے گا۔''

''آہستہ اور آہستہ......!''

ڈرائیور کو بہت غصہ آیا کرتا تھا کہ جانے سارے جہاں کا درد ان بیگم صاحبہ کے کلیجے میں کیوں گھس آیا ہے۔ اور بھی بیگمات سکول میں آتی ہیں، اپنے بچوں کے علاوہ کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں بلکہ موٹر چلاتے وقت غور بھی نہیں کرتی تھیں کہ آس پاس کوئی بچہ ہے یا نہیں۔

لیکن رفیقہ بیگم کو سڑک پر چلنے والے ہر بچے کا فکر ہوتا تھا۔ رفیقہ بیگم کی اپنی دو لڑکیاں تھیں نادیہ دس برس کی تھی اور ہادیہ چھ برس کی تھی۔ دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتی تھیں اور بیگم صاحبہ روزانہ انہیں خود لینے آتی تھیں اور خود چھوڑنے جاتی تھیں۔ ان سے پہلے بیگم صاحبہ کے چار بیٹے پیدا ہوئے تھے، مگر۔۔۔ پیدا ہوتے ہی مرجھا گئے تھے، پھر بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد یہ دو بچیاں بچ گئی تھیں تو انہوں نے اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر انہیں کلیجے سے لگا لیا تھا اسی لیے شاید وہ جان گئی تھیں کہ اولاد بڑی مہنگی چیز ہوتی ہے اور بچوں کے دکھ ماں باپ سے سہے نہیں جاتے۔ سڑک پر پیدل چلنے والا ہر بچہ انہیں بڑا قیمتی لگتا تھا وہ کسی ماں کے گھر کا اجالا۔۔۔ اور دل کا چین تھا۔ انہیں یوں لگا کرتا جیسے ہر بچہ ان کا اپنا بچہ ہے۔ خصوصاً جب وہ سڑک پر ننھے منے لڑکوں کو جاتا ہوا دیکھتیں تو انہیں ان پر بہت پیار آتا۔ ان کی قسمت میں اپنا بیٹا نہیں تھا تو کیا ہوا۔ دوسروں کے بیٹوں کو دیکھ کر خوش تو رہا جا سکتا ہے نا۔۔۔!

انہوں نے اپنی دونوں لڑکیوں کو سکول اتار دیا تھا۔ واپسی پر وہی سڑک بڑی سنسان تھی جس پر تھوڑی دیر پہلے موٹروں کا شور، بسوں کے ہارن اور بے شمار سکوٹر اور سائیکلیں نظر آ رہی تھیں کہ راستہ ملنا دشوار تھا۔

وہ جب ماڈل ہائی سکول کے آگے سے گزریں...... تو انہیں وہی بچہ یاد آ گیا --- جو خدانخواستہ صبح صبح ان کی موٹر کے نیچے آ جاتا تو کیا ہوتا ---؟

اف --- کسی ماں کا کلیجہ مسل کے کیا وہ بقیہ زندگی خوش رہ سکتیں ---!

اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

پھر انہیں خیال آیا --- کہ اگر ان کا پہلا بیٹا زندہ ہوتا تو آج اس لڑکے کے برابر یونہی نویں دسویں جماعت میں پڑھتا ہوتا ---

اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں اور بھی بہت سے خیال آئے --- عجیب بات ہے۔

رات تک اس لڑکے کا خیال ان کے حواس پر چھایا رہا ---

جو بدتمیز تھا، تندخو اور تنگ مزاج تھا ---

جھگڑالو تھا ---

اور غریب بھی تھا ---

……☆……

دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب بے اختیار بیگم صاحبہ کی موٹر ماڈل ہائی سکول کے اندر داخل ہوگئی اور سیدھی پرنسپل صاحب کے دفتر کے باہر رک گئی۔ بیگم صاحبہ موٹر سے نکل کر جب پرنسپل صاحب کے دفتر میں داخل ہوئیں تو پرنسپل صاحب بوکھلا گئے۔ وہ اپنے معمولی سے دفتر میں ایسی شاندار بیگمات کی آمد کے عادی نہ تھے، بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔

یہ سکول درمیانہ درجہ اور نچلے درجہ کے ملازمین کے بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ سائیکل

سوار تو بہت آتے تھے، موٹر والے یہاں نہیں آتے تھے جب کہ سڑک کے پار--- ایسے بچوں کے لیے ایک عالی شان سکول ایک عالی شان عمارت میں تھا۔

''تشریف رکھیے۔'' پرنسپل صاحب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''فرمایئے...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''جی۔ مجھے ایک لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو......''

پرنسپل صاحب حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بیگم صاحبہ کا منہ دیکھنے لگے---

''فرمایئے...... فرمایئے......!'' انہوں نے مزید کہا۔

''آپ کے سکول میں ایک لڑکا پڑھتا ہے۔ اس کا نام غیور احمد ہے۔ غالباً نویں جماعت میں ہے۔''

پرنسپل صاحب نے گھنٹی بجائی۔

چپڑاسی نمودار ہوا۔

بولے۔ ''نویں جماعت کے سارے رجسٹر لے آؤ۔''

جلد ہی معلوم ہو گیا کہ غیور احمد نویں جماعت کے سیکشن ''سی' میں پڑھتا ہے۔

سی سیکشن کے ماسٹر صاحب کو بلایا گیا۔

وہ آتے ہی شروع ہو گئے۔

''ذرا جھگڑالو سا لڑکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ پڑتا ہے۔ کسی کی بات برداشت نہیں کرتا۔ کسی کا رعب نہیں مانتا...... من مانی کرتا ہے۔ ضرور اس نے کوئی بدتمیزی کی ہوگی سڑک پر......''

''آپ مجھے یہ بتائیں جناب...... '' بیگم صاحبہ آہستگی سے بولیں۔

''وہ پڑھائی میں کیسا ہے۔۔۔؟''

''اچھا ہے۔'' ماسٹر صاحب جلدی سے بولے۔ ''ٹھیک ہے۔'' پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگے:

''عجیب لڑکا ہے۔ کبھی تو کلاس میں فرسٹ آ جاتا ہے اور کبھی پیپر ہی نہیں دیتا۔ اگر پوچھا جائے تو کہتا ہے میرے پاس کتابوں کے پیسے نہیں تھے اور اگر کہا جائے کہ بھئی پھر سکول کیوں آتے ہو تو الجھ پڑتا ہے۔ کہتا ہے کون مائی کا لال مجھے سکول آنے سے منع کر سکتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔''

''شکریہ بہت بہت۔ ماسٹر صاحب!''

بیگم صاحبہ نے جب ان تمام معلومات کے لیے ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تو وہ اٹھ کر چلے گئے۔

پھر بیگم صاحبہ پرنسپل کو مخاطب کر کے بولیں:

''جناب! میں یہ جانتی ہوں کہ غیور احمد غریب لڑکا ہے، مگر اس لڑکے میں مجھے بہت سے گوہر بھی نظر آئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں یہ لڑکا آگے بڑھے اور دنیا سے اپنا آپ منوائے۔ اس لیے آج میں یہاں آئی ہوں۔ آپ سے یہ کہنا تھا کہ جب تک یہ لڑکا آپ کے سکول میں ہے، اس کے تمام تر تعلیمی اخراجات میں اٹھاؤں گی، یعنی ایک مخصوص رقم آپ کی معرفت وظیفے کے طور پر اس بچے کو دوں گی۔ یہ میں اپنے طور پر کر سکتی تھی مگر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ یہ لڑکا بہت حساس اور غیرت مند ہے۔ شاید اس طرح کا وظیفہ قبول کرنے کی اس کا ضمیر اجازت نہ دے اور ممکن ہے یہ احساس کہ کوئی اس کے اخراجات ادا کر رہا ہے، اس کو مضمحل کر دے۔ میں اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ میں یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔ یہ رقم میں ہر

ماہ آپ کو پہنچایا کروں گی اور آپ سکول کی طرف سے کوئی وظیفہ مقرر کر کے اس تک پہنچایا کریں گے۔ امید ہے آپ میری اتنی سی مدد ضرور کریں گے۔" پرنسپل صاحب۔۔۔"اس طرح ہم قوم کے ایک بچے کو سنوار لیں گے۔"

بیگم صاحبہ خاموش ہوگئیں...... مگر حیرت کے مارے پرنسپل صاحب ابھی تک بولنے کے قابل نہ ہو سکے۔ اور جب ان کی خاموشی پر بیگم صاحبہ کو حیرت ہونے لگی تو بہت زور لگا کر صرف اتنا کہہ سکے۔

بیگم صاحبہ...... خدا...... خدا کرے...... کہ ہمارے معاشرے میں آپ جیسے اور لوگ بھی پیدا ہوں جو بچوں کو سڑکوں پر سے اٹھا کر گودیوں میں بٹھا لیں۔

............☆............

بڑی سی موٹر...... جب بابا جلال الدین کے کوارٹر کے آگے رک گئی تو وہ کپڑے سیتا سیتا چونک گیا۔ اس نے سوئی کپڑے میں اڑس دی۔ اور ناک پہ ٹکی ہوئی عینک کی کمانی درست کر کے اسے دوبارہ لگا لیا اور غور سے اس بیگم کو دیکھنے لگا جو جاہ و جلال کا پیکر نظر آ رہی تھی، مگر موٹر سے اتر کر اس کے بوسیدہ کوارٹر کی طرف ہی آ رہی تھی۔ ایک عرصہ سے اس نے اپنے کوارٹر میں "ٹیلرنگ شاپ" کھول رکھی تھی۔ وہ مردانے اور بچگانے کپڑے سیتا تھا۔ کئی عورتیں اپنے بچوں کے کپڑے سلوانے آتی تھیں مگر اس طرح کی شاندار بیگم لمبی موٹر میں کبھی نہ آئی تھی۔ بھلا ایسی بیگموں کو کوارٹروں کے درزیوں سے کپڑے سلوانے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ ان کے لیے بڑی بڑی روشن دکانیں کھلی ہوئی ہیں بلکہ ریڈی میڈ کپڑوں کے بازار کھلے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی جب عید پر کام کارش ذرا زیادہ ہو جاتا تو ان بڑی کوٹھیوں کی بیگمیں ضرور اس کی طرف رجوع کرتی تھیں۔ وہ بھی صرف شلوار اور کرتے کے لیے۔۔۔ مگر آج اس بیگم کو آتا دیکھا تو بابا جلال دین سمجھا کہ ضرور کسی کوٹھی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادھر

آ گئی ہیں۔

مگر جب انہوں نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

''بابا جلال دین کی دکان یہی ہے؟''

تو بابا جلال دین واقعی چونک اٹھا۔ چند ثانیے بیگم صاحبہ کو غور سے دیکھتا رہا تو دور بیٹھے ایک لڑکے نے جلدی سے جواب دیا۔

''جی ہاں--- یہی دکان ہے---''

تب بیگم صاحبہ نے اس لڑکے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں-- سترہ اٹھارہ سال کا ہوگا اور بالکل غیور کا بھائی معلوم ہو رہا تھا۔ بابال جلال دین نے دیکھا' بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں کپڑوں کا کوئی بنڈل نہیں تھا پھر نہ جانے کیوں وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی تھیں۔

وہ دکان کے اندر آ گئیں اور بولیں:

''کیا میں بیٹھ جاؤں---؟''

اب بابا جلال دین کو ہوش آیا۔ ''بیٹے کرسی لاؤ---!'' اس نے بیٹے سے کہا۔

بیٹا جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ دور ایک کرسی پڑی تھی جس کے بید کی ٹوٹی ہوئی رسیاں' سویوں کی طرح لچھے بنی ہوئی تھی اور ان پر پہلے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ جلدی سے کپڑے اٹھا کر اسی کرسی کو جھاڑ کر لے آیا--- اور بڑے معذرت خواہانہ انداز کے ساتھ وہاں کرسی رکھ دی' مگر بیگم صاحبہ...... وہیں چٹائی پر بابا جلال دین کے پاس بیٹھ گئیں اور لڑکے سے بولیں۔

''بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟''

وہ بولا۔

''سرور احمد۔''

''ہاں تو بیٹا سرور احمد ایک کام کر دو۔'' انہوں نے پرس کھول کے پیسے نکالے اور بولیں۔

''دو میٹھے پان لے آؤ۔'' حیران حیران سے لڑکے نے ان کے ہاتھ سے پیسے لیے اور باہر نکل گیا۔

بیگم صاحبہ نے وقت ضائع نہیں کیا۔

جلدی سے بولیں۔

بابا جی آپ حیران بالکل نہ ہو۔ میں نے آج آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے بیٹے غیور احمد نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کر لیا ہے۔''

''جی---!''

بابا جلال دین نے یوں گردن ڈالی جیسے یہ فضول بات سن کر انہیں مایوسی ہوئی ہے۔

''اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟ یعنی اس کے بارے میں---؟''

''جی کیا ارادہ ہوگا۔ میں تو پچھلے دو سال سے کہہ رہا ہوں، وہ بھی بھائی کے ساتھ میری دکان پر بیٹھ جائے۔''

''اتنے اچھے نمبر لے کر بھی---؟''

''جی تو میں اسے کیسے پڑھاؤں---؟ آپ امیر لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل تعلیم کے اخراجات کتنے بڑھ گئے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے آٹھویں جماعت تک پڑھایا ہے۔ ایک سال دکان پر بٹھایا مگر یہ لڑ جھگڑ کر سکول چلا گیا۔ میرے پاس تو کتابوں کے پیسے بھی نہ تھے--- پرنسپل صاحب کو ترس آ گیا۔ انہوں نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طرح اس نے میٹرک کر لیا۔ بلکہ صوبے بھر میں اول آیا ہے۔ کالج میں فارم دے دیا تھا۔ اس نے دو تین جگہ سے اسے بلاوا آ گیا ہے مگر بیگم صاحبہ--- بھلا سوچیں تو میں ایک ضعیف آدمی

ہوں- دو تین بیٹیاں ہیں--- ایک بیوی ہے' ایک بیٹا ہے- ساتھ مل کر کچھ کام کرا دیتا ہے--- میں تو اس کے داخلے کی فیس نہیں ادا کر سکتا- اسے کیسے پڑھاؤں گا- بس یہی باپ دادا کا کام اچھا ہے- پڑھ لکھ کر کون سی ہزاروں کی نوکری مل جائے گی' پھر نوکری میں گزارا کب ہوتا ہے- اگر یہ کام سیکھ لے تو میں اسے بڑی دکان کھول دوں گا-''

بیگم صاحبہ تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہیں-

پھر انہوں نے مختصراً بابا جلال دین کو' موٹر کی ٹکر سے لے کر سکول جانے اور وظیفہ مقرر کرنے کی بات بتا دی-

ابھی بابا جلال دین ورطہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ بولیں:

''بابا جی--- میں چاہتی ہوں غیور جیسے بچوں کو پڑھایا جائے- یہ بچے ہماری قوم کا مستقبل ہوتے ہیں- اللہ نے مجھے توفیق دی ہے کہ میں ایک بچے کے اخراجات اٹھا سکتی ہوں اور یہی کہنے میں آج آپ کے پاس آئی ہوں- وقت کم ہے کہیں آپ کا بیٹا نہ آ جائے- میں صرف یہ بات آپ سے کہنا چاہتی ہوں کہ جب تک غیور تعلیم حاصل کر رہا ہے- اس کے اخراجات میں اٹھاؤں گی- اس کے لیے ہر سال میں ایک مخصوص رقم بنک میں رکھوا دیا کروں گی- یہ میرے بنک کا اکاؤنٹ نمبر ہے- انہوں نے سلپ نکال کر بابا جی کو دی---

آپ غیور کو کبھی نہ بتائیں کہ یہ سب کون اور کیوں کر رہا ہے- وہ اور طرح کا بچہ ہے' چڑ جائے گا- بس ہر ماہ--- اس کی مطلوبہ رقم اس بنک میں سے لے کر اسے دے دیا کریں اور مہربانی کر کے اسے ضرور پڑھائیں اور اپنی قوم کو ایک اچھا بچہ دیں-''

بابا جلال دین کا بوڑھا ہاتھ لرز رہا تھا' جس میں سلپ پکڑی ہوئی تھی اور ان آنکھیں میں دو گدلے سے قطرے نمایاں ہوئے تھے--- اور وہ کہنے کے لئے موزوں الفاظ تلاش کر

رہے تھے کہ ایک دم --- ہاتھوں میں پان پکڑے سرور احمد نمودار ہوا۔

بیگم صاحبہ فوراً کھڑی ہو گئیں اور سرگوشی میں بولیں۔ ''یہ راز صرف میرے اور آپ کے درمیان ہے۔ میں کبھی کبھی ضرور آیا کروں گی۔''

''اچھا......''

انہوں نے سرور احمد کے ہاتھ سے پان لے لیے اور بولیں:

''شکریہ بیٹا---''

سرور احمد کی سانس ابھی تک پھولی ہوئی تھی اور وہ حیرت سے اس خوب صورت بیگم صاحبہ کو دیکھ رہا تھا جو اس سے صرف پان منگوانے یہاں تک آئی تھیں۔

''بیٹا آپ نے کتنی جماعت پڑھی ہیں؟''

''جی میں نے مڈل پاس کیا ہے، پھر ابا نے مجھے دکان پر بٹھا لیا تھا۔''

''بہت اچھی بات ہے، ابا کا ہاتھ بٹایا کرو۔''

یہ کہہ کر وہ دکان سے اتر آئیں۔

اور دھیرے دھیرے چلتی اپنی موٹر میں بیٹھ گئیں۔

''ابا......ابا......''

سرور احمد اپنے باپ کو بلا رہا تھا۔

''ابا یہ بیگم کیوں آئی تھی---؟''

''کیا کسی کا پتہ پوچھتی تھی---؟''

''ابا یہ تمہارے ہاتھ میں کیا پکڑا ہے---؟''

تب بابا جلال دین نے وہ سلپ اپنی مٹھی میں دبا لی اور اپنی عینک اتار کے اپنے ملگجے کرتے سے اپنی گدلی آنکھیں صاف کیں۔

اور سرگوشی کی سی آواز میں بولا---

''خداوند کبھی کبھی انسانوں کی اس نگری میں فرشتے بھیج دیتا ہے۔''

…………☆…………

غیور احمد کا ایم ایس سی میں آخری سال تھا، جب بابا جلال دین پر فالج کا حملہ ہوا۔ زندگی بھر پیراہن رفو کرنے والے ہاتھ منجمد ہو گئے اور یوں لگا---قدرت کی سنگدل مشین اس کی زبان کو تالو کے ساتھ ٹانک گئی ہے۔

غیور احمد نے بابا کو ہسپتال میں داخل کرا دیا اور ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ باپ تو یوں بھی محترم ہوتا ہے، قبلہ و کعبہ ہوتا ہے---مگر غیور احمد پر اپنے باپ کے احسانات دوہرے تہرے تھے۔ وہ سمجھتا تھا اس کے بابا نے واقعی لہو جلا کر اسے پڑھایا ہے، اور نہیں چاہتا تھا کہ اس عالم میں ضعیف باپ جان دے دے، جب کہ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے بھی نہیں۔ وہ بڑا آدمی بن کے---بابا کے دلدر دور کرنا چاہتا تھا۔ کچھ لوٹانا چاہتا تھا---اس لیے پٹی کے ساتھ پٹی بن کے بیٹھ گیا تھا۔

ایک شب، جب پو پھٹ رہی تھی---اور صبح کی نوکیلی کرنیں رات کی قبا چاک کر رہی تھیں---بابا نے اچانک آنکھیں کھول دیں......

اپنے قریب غیور احمد کو دیکھ کر---اس کی آنکھوں میں روشنی آ گئی---اور پھر نہ جانے کیسے زبان میں جان پڑ گئی۔ لکنت زدہ لہجے میں غیور کو قریب بلایا اور بولا:

''بیٹا......میں......تو جا......رہا ہوں......ایک راز......میرے سینے میں تھا......وہ ......اگر ساتھ......لے گیا......تو انسانیت......ہمیشہ نوحہ......کرتی رہے گی......''

پھر اس کی سانس اتھل پتھل ہو گئی۔

غیور احمد نے پھڑ پھڑاتے ہوئے سینے کے ساتھ اپنے کان لگا دیئے۔ دل ابھی دھڑک

رہا تھا۔ شاید اس راز کے بوجھ سے۔

بابا نے اپنی مردہ آنکھیں کھولیں، اور بولا:

"ایک بیگم صاحبہ ہے…… جب…… تم نویں میں پڑھتے تھے…… تو اس کی…… موٹر کے…… ساتھ ٹکر لگی تھی…… تمہاری…… تب…… سے اب تک…… وہ…… تمہاری…… پڑھائی…… کا…… خرچہ اٹھا رہی…… ہے۔ یاد…… رکھنا…… احسان فراموش…… کمینے ہوتے ہیں……

بنک کی کاپی…… میری…… واسکٹ…… کی…… جیب…… ج…… ج……" بابا فقرہ پورا نہ ادا کر سکا۔

قدرت کو سسپنس بہت پسند ہے۔ کب وہ ساری بات کہنے دیتی ہے؟

غیور احمد پر دو صدمے ایک ساتھ ٹوٹے…… بہت دن تک وہ کڑھتا رہا۔ روتا رہا۔

آخر بابا نے یہ سب کچھ اسے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اس نے کھرچ کھرچ کے اپنے ذہن سے اس بیگم صاحبہ کا شبیہ نکالی جو ایک دن اسے سڑک پر ملی تھی اور جس کا تاثر بہت ہی کڑوا، بہت ہی تلخ تھا۔ اسے تو موٹروں والی تمام بیگمات سے نفرت تھی جو صبح صبح بج بن کے اپنے بچوں کو چھوڑنے سکول آیا کرتی تھیں---

کیا بیگمیں ایسی فرشتہ خصلت بھی ہوتی ہیں؟

پہلے تو بہت دن تک اسے غصہ آتا رہا کہ وہ اپنے باپ کی کمائی سے نہیں، خیرات سے پڑھ رہا تھا۔ اپنے باپ پر بھی غصہ آتا رہا۔

مگر کچھ دن بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تو اپنے باپ کو مجبور پایا اور اپنے آپ کو بھی--- اگر یہ سب نہ ہوتا تو آج وہ غیور احمد نہ ہوتا۔

اگلے مہینے جب وہ اپنی فیس کی رقم لینے بنک گیا تو وہاں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا

اس بیگم صاحب کا اتہ پتہ جاننے کے لیے---مگر بنک کے ہر فرد نے انکار کر دیا- ان میں سے کوئی بھی اس بیگم کو نہ جانتا تھا- جانے کب غیور احمد کے نام کچھ رقم جمع کرا دی گئی تھی- یہ رقم کسی اور بنک کی معرفت یہاں آیا کرتی تھی اور ہدایات میں درج نہیں تھا کہ غیور احمد کو اس بنک کا بھی پتہ بتایا جائے-

سو اپنی پڑھائی کا آخری سال---اس نے ایک عجیب سے کرب، سوز اور تپش میں گزارا- کیسا ہلکا پھلکا تھا پہلے---مگر اب ہر سو، ہر طرف وہی بیگم صاحبہ نظر آتیں- ہر جاتی ہوئی موٹر کو وہ غور سے دیکھتا، ہر بیگم کو اس طرح گھورتا کہ وہ برا مان جاتی- اس کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ اس بیگم صاحبہ کی اس وقت کیا عمر تھی اور اب کیا عمر ہو گی-

ہاں---سولہ سال گزر گئے تھے-

اور ظاہر ہے---کہ اب وہ بڑی عمر کی خاتون ہوں گی-

کاش! کسی روز وہ کسی سڑک پر مل جاتیں تو وہ ان کا خوشبودار ہاتھ تھام کر کہتا:

''اونچی ماں!

دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ لگنے دی-

میرے ننھے سے جرم کی اتنی بڑی سزا---!

اب اگر کچھ بن کر نہیں دکھاؤں گا تو تیرے حلال کے روپے..... میرے تن میں پڑے نوحہ کرتے رہیں گے-''

☆

سرفراز احمد ساقی اس بورڈ کے ممبر تھے جو آج تمام نوجوان سی ایس پی افسروں کا انٹرویو لے رہے تھے- تحریری امتحان ہو چکا تھا اور غیور احمد نے اس میں ٹاپ کیا تھا- آج دو بدو ذہانت کو تولنے کا دن تھا-

غیور احمد جب اندر آیا--- تو اس کے تیور عام نوجوانوں والے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا وہ ساری دنیا سے خفا ہے--- جواب دینے نہیں آیا' لڑنے آیا ہے۔ حالانکہ ہر سوال کا جواب جیسے اس نے اپنی ہتھیلی پر رکھ چھوڑا تھا۔

ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔

اور انٹرڈیو لینے والی ٹیم کو حیرت زدہ کرتا رہا۔

آخر میں ساقی صاحب بولے:

''غیور احمد صاحب! آپ کا انداز بڑا جارحانہ ہے۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے آپ انٹرویو دینے آئے ہیں اور یہ مسئلہ آپ کے لیے زندگی جتنا اہم ہے۔''

''میں جانتا ہوں سر۔'' غیور احمد بڑی خود اعتمادی سے بولا۔

''سر میرا انداز اس لیے جارحانہ ہے کہ آج یہاں میری کوئی بڑی سفارش نہیں۔'' سب بیٹھے ہوئے لوگ ایک دم چونک گئے......

''یہ تو درست ہے کہ تمہارے علاوہ ہر لڑکے کی سفارش آئی ہے' تو کیا یہ مسئلے کا حل ہے۔''

''نہیں سر--- جب مجھے معلوم ہے کہ میرے مقابلے میں کوئی اور سلیکٹ کر لیا جائے گا تو میں پیشگی اپنا غصہ نکال رہا ہوں۔''

اس پر پوری ٹیم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ایسی صورت میں تو تمہیں بڑی نرمی اور ملائمت سے بات کرنی چاہیے تھی۔'' ساقی صاحب دوبارہ بولے۔

''ساقی صاحب! جب میں آپ جتنا بڑا انسان بن جاؤں گا' زمانے سے اپنی محرومیوں کا بدلہ لے لوں گا تو مجھے بھی آپ کی طرح گفتگو کرنا آ جائے گا۔''

''بیٹا!'' ساقی صاحب ایک دم بولے۔

''مقام حاصل کرنے کے لیے جارحیت کی نہیں، محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''محنت کرتا رہا ہوں، کر رہا ہوں، کروں گا۔ محنت کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں ایک مفلس آدمی کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ اتنا غریب تھا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم نہیں دلوا سکتا تھا۔ اس نے مرتے وقت مجھے بتایا کہ میری تعلیم کے سارے اخراجات ایک نیک خاتون نے اٹھائے ہیں جس کا نام تک میں نہیں جانتا۔''

''سر! میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں۔۔۔؟ میں سوچتا ہوں میں آج جو کچھ بھی ہوں، اس خاتون کی خدا ترسی کی وجہ سے ہوں۔ اس طرح احساس کمتری کا شکار ہو کے جارحانہ انداز اختیار کر لیتا ہوں۔ دوسری طرف اس کوشش میں بھی مبتلا رہتا ہوں کہ اپنا کوئی مقام پیدا کر لوں۔ اس نیک عورت کا پیسہ ضائع نہ ہو جائے۔''

''تو ایسے میں، میں کیا کروں سر۔۔۔؟''

''شاباش!'' ساقی صاحب بولے۔ ''تم سچ بولتے ہو اور تم نے اپنے آپ کو پہچانا ہے۔ انشاء اللہ ایک دن ضرور کامیاب انسان بن جاؤ گے۔ ہاں مگر یاد رکھنا، تمہاری صلاحیتوں کی تمہارے ملک کو ضرورت ہے۔ جب تک انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرتے رہو گے، اس نیک خاتون کو صدقہ جاریہ کا اجر ملتا رہے گا۔''

غیور احمد نے سر جھکا لیا۔

اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ اس نے انٹرویو کے کمرے میں غیر ضروری اور فضول گفتگو کی ہے جس میں ساقی صاحب کے علاوہ کسی نے حصہ نہیں لیا۔ باقی پانچوں ممبر خاموش بیٹھے تھے۔

''کیا اسی طرح اپنا گریبان چاک کر کے اپنا ننگا سینہ دکھاتے ہیں؟''

اسی وقت ایک صاحب نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بڑی نرمی سے بولے:

''بیٹا! ایک معاشرہ ایک جسم کی مانند ہوتا ہے اور معاشرے کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء ہوتے ہیں۔ اگر ایک ہاتھ نے، دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرا دی یا ایک آنکھ نے، دوسری آنکھ کو راستہ دکھا دیا تو یہ نہ تو معیوب ہے اور نہ حیرت انگیز --- کسی نیک خاتون نے تمہیں علم کا اجالا بخشا --- اب اس کو جلنے کڑھنے میں ضائع کرنا ٹھیک نہیں --- اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ اور جب تمہیں زندگی میں ایسا موقع ملے تو کسی مظلوم اور بے کس انسان کا ہاتھ تھام کر اسے پار لگا دینا۔ یونہی چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ان احسانات کو اپنے ذہن کا بوجھ نہیں بنانا چاہیے، بلکہ نیکی کا یہ سلسلہ آگے منتقل کر دینا چاہیے......!''

☆

جب لڑکی یا لڑکا سولہ سترہ برس کے ہوتے ہیں تو خیالوں اور خواہشوں کا ایک طویل قافلہ ان کے ساتھ مل پڑتا ہے۔ ہر روز ان کے آنگن میں تمنا کا نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ اور ہر شب احساس کی فصیل پر آرزو کا اک نیا چاند اترتا ہے۔ ان دنوں جب زندگی کا احساس جاگتا ہے تو چاروں طرف خوشبوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑتے ہیں۔ انہی دنوں، ذہن میں کبھی کئی روزن کھل جاتے ہیں -- عام طور پر لڑکیاں اور لڑکے --- نت نیا روپ دھار لیتے ہیں۔ کبھی شاعر بن بیٹھتے ہیں، کبھی ادیب، کبھی مصور، کبھی موسیقار۔ امنگیں زندگی کا راستہ دکھاتی ہیں۔ اور ایک روش آپ ہی آپ بنتی جاتی ہے۔

غیور احمد بھی ہائی سکول میں پہنچا تو ٹوٹے ہوئے شعر کہنے لگا۔ اپنے تپتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈک بخشنے کے لیے، الفاظ کے چھینٹے مارا کرتا تھا۔ انہی دنوں اسے کسی نئے تخلص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسا تخلص جس سے وہ جانا پہچانا جائے --- اس کو اپنی ذات پر گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لگا دیتا۔

وہ کسی خان، چوہدری، ملک، مغل، بہادر یار جنگ کا بیٹا نہیں تھا کہ پہچان کی ایک پرچھائیں آپ ہی آپ اس کے ساتھ لگ جاتی- تب اس نے سوچ سوچ کے--- اپنا تخلص ''سرمدی'' رکھ لیا- ''غیور احمد سرمدی'' لکھ کے اسے ایک سرمدی سا سرور حاصل ہوا تھا

سکول میں لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اسے ''سرے دانی'' کہتے تھے- کالج میں وہ ڈی بیٹ اور مشاعروں میں حصہ لینے لگا تھا- اس لیے اسے باقاعدہ ''غیور احمد سرمدی'' کہہ کر بلایا جاتا- یونیورسٹی میں لوگ باقاعدہ اسے ''سرمدی'' کہنے لگے تھے بلکہ یونیورسٹی میں اس کا ذاتی نام غیور احمد قصہ پارینہ بن گیا تھا-

لیکن اب--- جب اسے مستقل ملازمت مل گئی اور وہ ایک شاندار دفتر میں بیٹھنے لگا تو صرف ''سرمدی صاحب'' تھا-

غیور احمد سرمدی پر سرفراز ساقی ہمیشہ مہربان رہے- اتفاق سے وہ انھی کا جونیئر افسر لگ گیا تھا...... اس لیے...... ملازمت کے ساتھ ساتھ اسے زندگی کے نشیب و فراز بھی سمجھانے لگے تھے-

کبھی کبھی وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آتے اور اپنی سٹڈی کے خوبصورت آتشدان کے آگے بیٹھ کر اس سے بے شمار باتیں کیا کرتے--- جب رات زیادہ ڈھل جاتی تو اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے-

غیور احمد سرمدی کو اکثر اس گھر پر جنت کا گمان ہوتا تھا- نہ تو وہ گھر کے اندر بے ہودہ قسم کا شور اٹھا، نہ سمع خراش آوازیں لائبریری کے ماحول کو آلودہ کرتیں اور نہ اندر سے بار بار ساقی صاحب کا بلاوا آتا-

ہاں اتنا غیور احمد سرمدی کو ضرور پتہ چل گیا تھا کہ ان کی صرف دو بیٹیاں ہیں-

کس عمر کی---؟

یہ اس نے جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔

یہ اس روز اسے پتہ چلا --- جب لائبریری میں بیٹھے بیٹھے ساقی صاحب نے غیور احمد سرمدی سے کہا۔

''بیٹا یہ کارڈ لو --- میری بیٹی کی شادی کے کارڈ ہیں اور یہ لسٹ بھی ساتھ ہے اور کل اپنے سٹینو سے ان کے پتے لکھوا کر انہیں پوسٹ کر دینا۔''

سرمدی نے صرف کارڈ پوسٹ کرنے کا کام ہی نہیں کیا --- بلکہ شادی کے دن ساری ذمہ داری یوں سنبھال لی جیسے وہی ساقی صاحب کا بیٹا ہے۔ مہمانوں کو بٹھانا، کھانا کھلانا، موٹر تک چھوڑنے جانا --- سب آنے والوں کا شکریہ ادا کرنا اور بار بار ساقی صاحب کو تشفی دینا۔

تیسرے روز ان کی بیٹی امریکہ جا رہی تھی۔

اس روز ساقی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ انہوں نے سرمدی کو بلایا اور کہا:

''بیٹے! سعدیہ آج اپنے شوہر کے ہمراہ امریکہ جا رہی ہے۔ بہت سے مہمان ایئرپورٹ جانا چاہتے ہیں۔ تم بھی اپنی موٹر لے آنا اور ہمارے ساتھ چلنا۔''

ایئرپورٹ پر بے شمار مہمان موجود تھے۔ واپسی پر اس کی موٹر میں کون کون بیٹھا، اس نے خیال نہیں کیا۔ وہ تو ساقی صاحب سے گفتگو کرتا رہا۔ گھر آ کر اس نے بڑے ادب سے جھک کر دروازہ کھولا ..... تو اس نے دیکھا پیچھے ایک سانولی سلونی سی دبلی پتلی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی ..... وہ ابھی تک رو رہی تھی اور گیلے گیلے آنسو اس کے ملیح رخساروں پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔

وہ موٹر میں سے نکلنے سے پہلے اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی، اور سرمدی اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت ایک خیال کوندے کی طرح لپک کر ساقی صاحب کے ذہن کو جھنجوڑ گیا۔ جب سب لوگ موڑ سے نکل کے چلے گئے۔ تو سرمدی نے بھی اجازت چاہی۔

مگر ساقی صاحب بولے:

''بیٹا! ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔''

وہ مودب سا بنا ان کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔

لائبریری میں وہ جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک سامنے دیوار کو دیکھتے رہے اور پھر بولے:

''بیٹا! ابھی ابھی ایک عجیب سا خیال میرے دل میں آیا ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسے خیال انسانوں کے دلوں میں کیوں ڈالتی ہے؟

میں نے سوچا--- ابھی تم سے کہہ دوں۔ بعض باتوں پر زیادہ سوچنے سے وہ الجھتی جاتی ہیں۔

تم نے دیکھا آج سعدیہ امریکہ چلی گئی ہے۔ آج میں بہت دکھی ہو رہا ہوں۔ آج مجھے پتہ چلا کہ بیٹیوں کی جدائی کے دکھ بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ یہ بے چاریاں قسمت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں۔ میری دو ہی بیٹیاں ہیں۔ سوچا تھا انہیں کبھی اپنے سے دور نہ کروں گا' مگر......

خیر یہ مشیت ایزدی ہے۔

ہاں...... ابھی ابھی...... جب تم ہادیہ کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے' میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ اگر میں تمہیں اپنا بیٹا بنا لوں تو میری ہادیہ میرے پاس ہی رہے گی اور ایک بیٹے کی کمی بھی پوری ہو جائے گی۔''

''جی...... جی......'' سرمدی اس طرح ہکلا گیا جیسے--- زمین سے اڑ کر ایک دم آسمان پر گیا ہو۔

''میرا ماضی جاننے کے باوجود...... یہ جاننے کے باوجود کہ میں کسی کے ٹکڑوں پر پلا ہوں۔''

''ہاں---!'' ساقی صاحب ہنس کر بولے۔

''تمہارے اندر کسی شریف آدمی کا خون ہے۔ مجھے انسانوں کی پہچان ہے اور میرا دل تمہاری طرف مائل ہے۔''

☆

کتنے سال ہو گئے تھے سرمدی کو ساقی صاحب کے گھر آتے ہوئے...... مگر وہ ہمیشہ مطالعے کے کمرے میں بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔ اس نے آج تک بیگم سرفراز ساقی کو نہیں دیکھا تھا' نہ گھر میں ان کی آواز ہی سنی تھی۔ اتفاق سے اس دن ان کی چھوٹی بیٹی ہادیہ کو دیکھ لیا تھا...... اور...... وہ اس کا مقسوم بننے جا رہی تھی۔ آج اس ضمن میں سرمدی ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا' ان کی بیگم کا انتظار کر رہا تھا۔ آج صبح ساقی صاحب نے سرمدی کو فون کیا تھا اور اس سے کہا تھا' میں نے بیگم کو اس رشتے کے لیے راضی کر لیا ہے' تم آج جا کر ان سے مل لو۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔

اتنا نروس تو وہ انٹرویو والے دن بھی نہیں تھا جتنا نروس آج ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں بیگم ساقی کس مزاج کی ہوں گی' وہ انہیں متاثر کر سکے گا یا نہیں--- ملازم اسے باقاعدہ ڈرائنگ روم میں بٹھا گیا تھا اور وہ بار بار اپنی ٹائی کی ناٹ درست کر رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے آج سب الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے اور کتر کتر چلنے والی زبان اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے گی۔

اس نے سارے ڈرائنگ روم کا اچھی طرح سے جائزہ لے ڈالا۔ ایسا ہی تھا جیسا ایک امیر آدمی کا ڈرائنگ روم ہونا چاہیے...... واقعی وہ ان لوگوں کے قابل نہ تھا' لیکن جب تقدیر

مہربانی کر رہی تھی تو وہ کیوں خوامخواہ احساس کمتری میں مبتلا ہوا جا رہا تھا- وہ سر جھکائے بیٹھا خیالات کی یورش کا مقابلہ کر رہا تھا کہ ایک دم کسی کے قدموں کی چاپ ابھری- سر اٹھاتے ہی وہ خود بخود کھڑا ہو گیا- ایک سرخ وسفید خاتون جو جلال و جمال کا پیکر رہی ہو گی، کمرے میں داخل ہوئی- اس کی پیشانی کشادہ تھی- بڑی بڑی آنکھوں میں چمک ہنوز باقی تھی- جسم ذرا فربہ تھا- کندھوں پر کالی شال ڈال رکھی تھی- اس نے سلام کر کے سر جھکا لیا-

ان کی شخصیت سے وہ ایک دم مرعوب ہو اٹھا- وہ قریب آ گئیں- اس کے سلام کا جواب دیا--- اور پھر اس کے کندھے کو تھپتھپایا--- گویا اسے دعا دے رہی ہوں-

ان کے ہاتھ کے لمس نے جیسے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا...... یوں جیسے اس کی نیند کھل گئی ہو اور اس کا بچپن آ کے آگے کھڑا ہو گیا ہو-

ایسا ہی لمس پہلے بھی اس نے اپنے کندھوں پر محسوس کیا تھا، جب نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور......

اس نے جلدی سے نظر اٹھا کر ان کے چہرے کو دیکھا تو وہ مسکرائیں...... سردی کے سینے میں الاؤ سلگ اٹھے-

اس کا سر چکرانے لگا، وہ بیٹھنا بھول گیا-

''بیٹھو بیٹا---!''

جب انہوں نے دوسری مرتبہ کہا--- تو وہ جلدی سے بیٹھ گیا- اصل میں اس کا دل چاہ رہا تھا، پھوٹ پھوٹ کر روئے--- بیگم صاحبہ کے گلے میں جھول جائے- چیخے--- چلائے

جنم جنم کا بوجھ جو اپنے دل پر لیے پھرتا تھا، ان کے حوالے کر دے......

ان سے پوچھے...... انہوں نے یہ نیکی دریا میں کیوں ڈال دی-

کیوں، کیوں آخر---؟

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتیں، سرمدی جلدی سے بولا۔

''میرا پورا نام غیور احمد سرمدی ہے۔ شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''ہاں سرفراز نے مجھے تمہارے بارے میں سب بتا دیا تھا۔'' وہ ہنس کر بولیں۔

''نہیں جی---ایک بہت پرانی بات ہے---جو آپ کو یاد نہیں آ رہی۔

ایک بار بچپن میں میری ٹکر آپ کی موٹر کے ساتھ ہوگئی تھی اور......اور......آپ نے......مجھے اس کی بڑی کڑی سزا دی......'' اس کا گلہ رندھ گیا۔

''اب اس بات کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب سرفراز نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا تو مجھے شک گزرا تھا کہ شاید تم ہی ہو۔''

''ویسے میں تمہیں سڑک پر دیکھ لیتی تو شاید پہچان نہ پاتی۔''

''ماشاءاللہ تم بڑے شاندار آدمی بن گئے ہو۔''

''یہ شاندار آدمی کس نے بنایا---؟ بیگم صاحبہ---!'' سرمدی نے تڑپ کر پوچھا۔

''اللہ تعالیٰ نے۔'' بیگم صاحبہ نے بڑے سکون سے کہا۔ ''اللہ کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔''

''اس کے باوجود......اس کے باوجود......'' سرمدی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی بیٹی کی شادی میرے جیسے آدمی کے ساتھ......''

''تو اس میں کیا برائی ہے؟ بہتر آدمی وہ ہوتا ہے جو بہترین کر دکھائے۔''

''بیگم صاحبہ'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے ساقی صاحب کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ میں ایک غریب کا بیٹا ہوں اور مجھے کسی نیک دل خاتون نے پڑھایا ہے......میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا......کچھ بھی نہیں۔''

''اچھا اب ایک میری بات بھی سنو۔'' وہ بولیں۔

''جی فرمائیں۔''

''میرے شوہر کو بالکل علم نہیں کہ میں ہی وہ خاتون ہوں۔ جس طرح آج تمہیں مجھے دیکھ کر تعجب ہوا ہے' اسی طرح تم سے دوبارہ اور اس انداز میں ملنا میرے لیے بھی باعث حیرت ہے۔ تم جانتے ہو۔۔۔ میں نے یہ سب کچھ کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں کیا تھا۔ مجھے تم اس وقت بھی اچھے لگے تھے اور میں نے سوچا تھا۔ میں تمہاری مدد کروں۔ سو تم نے اپنا مقام پا لیا لیکن شاید اللہ کی رضا کچھ اور ہے۔ وہ تمہاری صورت میں ہمیں ایک بیٹا دینا چاہتا ہے۔''

''اگر تمہیں منظور ہو تو۔۔۔!''

''جی کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''اصل میں' مرد ہمیشہ سے خودغرض رہا ہے۔۔۔ وہ فیصلہ کرتے وقت صرف اپنی خوشی کو مدنظر رکھتا ہے۔ میں عورت بھی ہوں اور ماں بھی۔۔۔ مجھے دوسرے کے دل کا خیال رہتا ہے۔ سرفراز نے اپنی خواہش تم پر ظاہر کر دی مگر تمہارا عندیہ نہیں لیا۔۔۔ اب تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ تمہیں ہادیہ سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔ تم کسی مجبوری یا دباؤ کے تحت تو ایسا نہیں کر رہے۔ اگر تم نے کوئی اور لڑکی پسند کر لی ہو تو مجھے بتاؤ۔۔۔ میں وہاں تمہاری شادی کرا دوں گی۔''

''مجھ سے ملنے کے بعد۔۔۔ اپنے اوپر کوئی دباؤ محسوس نہ کرنا۔''

سرمدی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا...... اور کس طرح ہاں کہے۔۔۔ ایک دم بلک بلک رونے لگا۔

بیگم صاحبہ نے دیکھا' کل کا وہ لاابالی بچہ آج کا خوب صورت نوجوان بن چکا ہے۔ چھ فٹ قد' گورا چٹا رنگ' مضبوط ہاتھ پاؤں' شریانوں میں دوڑتا ہوا صحت مند خون پورے

سراپے سے چمک رہا تھا- آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی...... مگر وہ ننھے بچوں کی طرح رو رہا تھا-

''بیٹا تمہارے رونے سے تو میں اور بھی گھبرا رہی ہوں-''

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں--- بیگم صاحبہ--- مگر کہہ نہیں سکتا-'' سرمدی نے ہچکیوں کے درمیان کہا-

اور پھر ایک دم کرسی سے اٹھ کر بیگم صاحبہ کے قدموں میں جھک گیا- اس کے گرم گرم آنسو بیگم صاحبہ کے پاؤں دھونے لگے-

بیگم صاحبہ نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر کرسی پر بٹھا دیا، پھر اندر سے تولیہ اٹھا لائیں اور اسے دے کر بولیں- ''جاؤ منہ دھو کر چہرہ صاف کر لو، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟''

وہ جب منہ صاف کر کے دوبارہ اندر آ کر بیٹھا تو بیگم صاحبہ نرم سا لہجہ بنا کر بولیں:

''آج میں تمہیں ایک نصیحت کرتی ہوں-

یہ جو تم بار بار کہتے ہو، میں ایک غریب آدمی ہوں اور مجھے کسی مخیّر خاتون نے پڑھایا ہے- آج سے یہ کہنا بند کر دو- زمانے میں ہر ایک کا ظرف وسیع نہیں ہوتا کہ تمہارے اخلاص کی اتھاہ کو پا لے- بلا ضرورت بہت سی باتیں نہیں کہنا چاہئیں- دل کے اوراق میں سمیٹ کے انہیں ذہن کے جز دان میں رکھ لینا چاہیے- اپنی اوقات کو یاد رکھنا اعلیٰ ظرفی ہے مگر اعلیٰ ظرف کی کتنے لوگو کو پہچان ہے، جوہری بھی اپنا سب سے قیمتی نگینہ کسی جوہر شناس کے آگے ہی کھولتا ہے اور سائل بھی دینے والے کا ہاتھ پہچان کر بھیک مانگتا ہے......

اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہادیہ کو کبھی پتہ نہ چلے--- ان سب باتوں کا- میں جانتی ہوں وہ میری بیٹی ہے، کم ظرف نہیں ہے- مگر ابھی معصوم ہے- ایسا نہ ہو...... یہ باتیں سن کر وہ تمہاری اتنی عزت نہ کر سکے جتنی اسے کرنی چاہیے......''

سرمدی کے آنسو پھر بہنے لگے۔

اگر جسم میں آنسوؤں کا دفینہ نہ ہوتا تو انسان کیا کرتے؟

انسان جو اپنے جذبوں کے ہمالیہ پر کر گونگے سے بن جاتے ہیں، زندگی بھر چلنے والی زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور الفاظ پر سے معانی کے لبادے اتر جاتے ہیں...... گونگے بہرے الفاظ اور چمڑے کی ایک ننھی سی زبان، ان عظیم جذبوں کا اظہار نہیں کر سکتی۔ تب کہیں سے آنسو، انمول موتیوں کی طرح نکل آتے ہیں، نہ ان کی رنگت ہے نہ ان کی خوشبو ہے، نہ ان کا جسم ہے نہ ان میں روشنی......

مگر کس طرح صاف صاف --- وہ سب کہنے لگتے ہیں جو کہنا چاہتے ہیں......

☆

''غیور احمد سرمدی'' کہنے کو گھر داماد تھا مگر اصل میں وہ بیگم رفیقہ سرفراز اور سرفراز ساقی کا بیٹا بن گیا تھا۔ اپنے بطن سے پیدا ہونے والے، اپنے خون کے استحقاق کے بل بوتے پر ماں باپ کی اتنی پروا نہیں کرتے --- زیادہ منواتے ہیں، کم مانتے ہیں --- مگر ذہنی رشتوں میں ایسے سقم نہیں ہوتے۔

لوگ بیگم سرفراز ساقی اور ان پر رشک کیا کرتے تھے اور تمنا کرتے تھے کہ انہیں ابھی ایسا داماد ملے۔

جب تک بیگم سرفراز زندہ رہیں، سرمدی نے کبھی نظر اٹھا کے ان سے بات نہ کی تھی۔

افسوس ان کا سفر سرفراز صاحب سے پہلے اختتام کو پہنچا۔ جس رات انہوں نے جانا تھا، سرمدی ان کے قدموں کے قریب بیٹھ گیا اور بولا:

''بیگم صاحبہ! کچھ میرے لیے فرمائیں۔''

انہوں نے اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں کھول کر سرمدی کو دیکھا اور مسکرا دیں۔ پھر

آہستہ سے بولیں:

”سرمدی...... میں دنیا سے جا رہی ہوں اور جانتے ہو، میری جھولی میں تمہارے سوا کچھ نہیں ہے۔ کبھی میں یاد آؤں تو میری مغفرت کی دعا کرنا---“

سرمدی کی آنکھوں میں پھر جھرنے کھل گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ضبط کر کے بولا:

”کوئی ایسی خدمت جو ہمیشہ انجام دیتا رہوں۔“

”نیکی کرتے رہنا۔ جس صورت میں بھی کر سکو...... ہاں اگر تمہارے دل پر ابھی تک میرے عمل کا بوجھ ہو--- اور اس کا بوجھ ہلکا کرنا چاہو--- تو کسی بے یار و مددگار کا ہاتھ تھام کر اسی طرح پار لگا دینا جس طرح میں نے تمہیں پار لگایا ہے۔ اپنے وطن کے نوجوان سڑکوں، گلیوں پر ضائع ہو جائیں، مجھے اس سے دکھ ہو جاتا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص کسی مستحق کا ہاتھ تھام لے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ میرا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ تم ایسا کر کے دکھانا--- چراغ جلتا چھوڑ جاؤ گے--- تو کوئی دوسرا اس سے اپنی لو روشن کرے گا۔“

بیگم صاحبہ نے اپنے چراغ کی لو بجھا دی۔

☆

سرمدی صاحب اپنے تکیے کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچے ہوئے رو رہے تھے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ رونا اس بات پر آ رہا تھا کہ باری تعالیٰ نے اتنی مصروف زندگی دے دی کہ وہ پلٹ کر کبھی یادوں کی پھلواری کو آنسوؤں کا پانی نہ دے سکے۔

کتنے خوب صورت چہرے نظروں سے دور ہو گئے۔ بیگم صاحبہ کے بعد سرفراز ساقی بھی چلے گئے......

خوب صورت لوگ جاتے جاتے کتنی خوب صورت نشانیاں دے جاتے ہیں اور سرمدی صاحب کے پاس تو ان کی خوشبودار دعائیں بھی تھیں۔

ان کے مقدر کا پودا تناور درخت بن گیا تھا- وہ درخت ہی کیا--- جس کی چھاؤں میں کسی کو سکھ نہ ملے- کبھی کوئی بانس کے درخت کے نیچے بھی پڑا ہے--- انسان کو گھنا اور سایہ دار درخت ہونا چاہیے' برگد کی طرح--- پھیلتا جائے' پھولتا جائے--- قدموں میں بکھرتا جائے-

کیا وہ صرف بانس کا درخت بننے کے لیے آئے تھے-

''میرا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ تم ایسا کر کے دکھانا- چراغ جلتا چھوڑ جاؤ گے تو کوئی دوسرا اس سے اپنی لو روشن کر لے گا-''

سرمدی صاحب کے کانوں میں بیگم صاحبہ کے جملے رس گھولنے لگے--- رات کا سناٹا گھنگھرو بجانے لگا--- اور وہ بے تابی سے اٹھ کر ٹہلنے لگے- شب کا پہلا پہر بہت ظالم ہوتا ہے-

مقفل دروازے کھول دیتا ہے اور درد کی آہٹیں قریب سے آنے لگتی ہیں...... دل مضطرب سا ہو گیا-

انہوں نے اٹھ کر ویلیم کی ایک گولی کھائی-

اور جب نیند ان کے پپوٹوں پر دستک دینے آئی تو اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی-

''بھلائی کی طرف آؤ---!''

انہوں نے سامنے لگی اپنی بڑی سی تصویر کی طرف دیکھا جس میں وہ ایک بڑے آدمی سے ہاتھ ملا رہے تھے-

چھوٹے ہاتھوں کی طرف بھی دیکھنا چاہیے-

انہوں نے دل میں کہا۔

''نماز نیند سے بہتر ہے۔''

بے شک انہوں نے دل میں دہرایا۔

الصلوہ خیراً من النوم

شکر ہے میں آج جاگا تو۔۔۔

انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی' پھر سے اللہ کا بے حد شکر ادا کیا اور پھر گولی کے زیر اثر سو گئے۔

بے سدھ۔۔۔ بے خبر۔

............☆............

صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو دن کے نو بج رہے تھے اور گھر میں خاموشی تھی۔ انہوں نے جلدی سے فون اٹھایا اور اپنے دفتر میں فون کر کے کہہ دیا کہ آج ان کی طبیعت خراب ہے' اس لیے آفس نہیں آ سکیں گے۔

اپنا ناشتہ کمرے میں منگوایا اور نوکر سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کہاں ہیں۔۔۔؟''

''جی وہ صبح بچوں کو سکول چھوڑنے گئی تھیں' ابھی تک نہیں آئیں۔'' نوکر بولا۔

''اور وہ لڑکا شعیب کہاں ہے۔۔۔؟''

انہوں نے پوچھا۔

''اسے بھی ساتھ لے گئی ہیں۔''

دس بجے کے قریب ان کی بیگم گھر میں داخل ہوئیں۔ نوکر نے جب بتایا کہ صاحب گھر پر ہی ہیں اور ان کی طبیعت ناساز ہے تو وہ ساری خفگی بھول کر مارے تردد کے ساتھ اندر دوڑی

آئیں۔

عام طور پر وہ بچوں کو چھوڑ کر نو بجے تک آ جایا کرتی تھیں کیونکہ ساڑھے آٹھ بجے بچوں کا سکول لگتا تھا اور وہ تینوں کو خود چھوڑنے جایا کرتی تھیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ہادیہ نے سرمدی صاحب کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عینک لگائے ایک ضخیم کتاب پڑھنے میں مگن تھے۔

انہوں نے کتاب ہٹا کر عینک اتار دی اور بیگم کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے---؟''

''ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔''

وہ دوسری طرف سے آ کر پلنگ پر بیٹھ گئیں اور مشکوک انداز میں بولیں۔

''آپ واقعی ٹھیک ہیں؟''

''ہاں---اچھا بھلا ہوں---ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''اور رات کو بھی ٹھیک تھے آپ؟''

''تم جانتی ہو جب تم رات کو میرے پاس سے اٹھ کر چلی جاتی ہو تو میں ٹھیک نہیں رہ سکتا۔ احتجاج تو کر نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ بیمار ہو جاتا ہوں۔'' سرمدی صاحب نے شرارت سے کہا۔

ہادیہ نے شرمندہ ہو کر چہرہ جھکا لیا اور آہستگی سے بولی۔

''مجھے افسوس ہے..... مگر رات کو مجھے رنج پہنچا تھا اور میں نے سوچا کہیں یہاں سونے سے بدمزگی نہ ہو جائے......''

بیگم رفیقہ نے ہادیہ کی اتنی اچھی تربیت کی تھی، نہ تو وہ شوہر کے آگے زبان چلاتی تھی، نہ اپنی بات منواتی تھی۔ اچھی بیویوں کی طرح ہمیشہ سمجھوتہ کر لیتی تھی یا کبھی کبھی ذرا سی دیر کو دور

جا کر تلخی کو زائل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

''مگر تم نے بہت اچھا کیا، جو رات مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔''

''کیوں۔۔۔؟'' ہادیہ نے حیرت سے نظریں اٹھائیں۔

''کبھی کبھی ظلم کرم بن جاتا ہے۔۔۔ رات تمہیں کیا معلوم کیا ہو گیا ہے؟''

''آپ آج کیسی پہیلیوں جیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''اچھا تم بتاؤ۔۔۔ تم کہاں سے آ رہی ہو۔۔۔؟ اتنی دیر کہاں لگائی۔۔۔؟''

پہلے تو وہ چپ بیٹھی رہی...... پھر آہستہ سے رک رک کر بولی۔

''میرا دل نہیں مانا کہ میں شعیب کو سکول کے گیٹ کے باہر چھوڑ آؤں۔۔۔ میں نے پتہ کر لیا ہے اس کے والدین حادثے میں مر گئے ہیں اور وہ لالچی شخص جو اس کو بچا کر لایا ہے، اس لیے اس کو اپنے پاس رکھنے پر آمادہ نہیں کہ...... اس کے عوض اسے کوئی جائیداد نہیں ملے گی اس لیے میں نے سوچا ہے، میں شعیب کو کسی یتیم خانے میں داخل کرا دوں گی اور خود اس کا دھیان رکھا کروں گی۔ ابھی یتیم خانے کے منتظم سے بات کر کے آ رہی ہوں، اب اس کو ضروری سامان خرید کر دوں گی اور جا کر چھوڑ آؤں گی۔''

یہ سب کہہ کر اس نے غیر یقینی انداز میں اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ سرمدی صاحب ابھی سے جھڑک دیں گے اور اس کے اس فعل کو بھی احمقانہ کہیں گے۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''کہاں۔۔۔؟'' وہ اور بھی حیران ہو کر بولی۔

''ہم دونوں اویس کے سکول جائیں گے، وہاں پرنسپل صاحب کے پاس جائیں گے اور ہر ممکن کوشش سے شعیب کو اویس کے سکول میں داخلہ دلوائیں گے۔''

''جی۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، میں اسی لیے تو آج دفتر نہیں گیا۔''

''مگر شعیب رہے گا کہاں؟''

''یہیں ہمارے پاس --- پہلے ہمارا ایک بیٹا تھا، اب دوسرا بیٹا خدا نے دے دیا ہے۔ ہم اپنی نیک بیوی کی نیکی میں شمولیت چاہتے ہیں۔ ہم وہی کریں گے جو ہماری پیاری بیگم چاہتی ہیں......''

''سرمدی......!'' ہادیہ کی آنکھوں میں اظہار تشکر کے لیے آنسو آ گئے......اور اس نے آہستہ سے اپنا سر سرمدی صاحب کے چوڑے سینے پر رکھ دیا۔

''ویسے اگر......'' سرمدی صاحب نے بیگم ہادیہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سرگوشی میں کہا...... ''تیسرا بیٹا بھی آ جائے تو ہمیں اعتراض نہ ہوگا۔''

اس بات پر روتی ہادیہ ہنس پڑی --- اور سرمدی صاحب کے دونوں بازو آپ ہی آپ مل گئے۔

ممتا

(افسانہ)

نیویارک سے پی آئی اے کے ذریعے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک لمبی اور نان سٹاپ فلائٹ ہے۔ تیئس چوبیس گھنٹے گویا اپنی ٹانگوں کو باندھ کر سفر کرنا پڑے گا۔ جہاز کے طویل سفر سے مجھے وحشت ہوتی ہے، اس لیے میں ایسی پروازوں کا انتخاب کرتا ہوں جو ملک ملک گھوم کر منزل مقصود پر پہنچائیں۔ کسی بھی نئے ملک کے ایئرپورٹ پر چند گھنٹے کی چہل قدمی بھی زندگی کو نئے تجربات اور جواز بخش دیتی ہے۔ مگر آج مجھے اسی فلائٹ سے ضروری اپنے وطن جانا تھا۔ کراچی سے آگے میری بکنگ لاہور کے لیے ہو چکی تھی۔

لاہور میں میری ماں شدید بیمار تھی اور اس نے یہ تیسرا تار بھیج کر مجھے بلایا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی ماں کا تار نکالا۔ وہ بے معنی الفاظ اثر سے خالی تھے۔ اپنی ماں کی شدید علالت سے میرے اندر کوئی ہلچل نہیں ہو رہی تھی۔ ماں ضعیف ہو، بیمار ہو--- اور اپنی ہٹ کی پکی ہو تو اسے مر جانا چاہیے۔ وہ اور زندہ رہ کر کیا کرے گی۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ آخر میں کیوں چلا آیا، مگر مجھے بھیجنے میں میرے دوست شبیر کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ مجھے بار بار احساس دلاتا تھا کہ اولاد کو آخر وقت تک اپنے فرائض کی ادائیگی کرنی چاہیے۔ میں ایسی کوئی بات نہیں مانتا تھا۔ جب شبیر نے میرا ٹکٹ لا کر میری جیب میں ڈالا اور میری فلائٹ کے بارے میں بتایا تو آئے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

میں نے ہاتھ میں پکڑے تار کو دوبارہ پڑھا۔

ماں کی حالت نازک تھی۔ اس نے لکھا تھا ''اگر تم نہیں آؤ گے تو میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔''

''اونہہ!'' میرا خون کھول اٹھا۔ وہ ذرا سا دودھ جو ماں بچپن میں پلا دیتی ہے، اس کا احسان کتنا جتاتی ہے، جیسے یہ اس کا کوئی بہت بڑا اعجاز ہو، مگر یہ سب قوانین قدرت ہیں۔ ایسی بھی تو مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو ایک گھونٹ دودھ بھی نہیں پلاتیں بلکہ اس دودھ کی لذت سے آشنا نہیں کرتیں اور ڈبے کا دودھ پی پی کر وہ شیر جوان بن جاتے ہیں۔ بھلا ان بچوں کی مائیں مرتے وقت بچوں کو کیا دھمکی دیتی ہوں گی۔

میں نے تار اپنی جیب میں ڈال لیا۔ جہاز اپنی پرواز پر والہانہ طور پر رواں تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا کہ اب سگریٹ پینے کی ممانعت ختم ہو چکی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نظریں گھما کر جہاز کے مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جہاز کی سیٹوں پر بیٹھ کر آدمی ہمسایوں کی طرح نہیں جھانک سکتا، مگر میں پھر بھی کوشش کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور میری نگاہ ایک کونے میں اٹک گئی۔ یوں تو ایک عرصے سے عورتوں کو جھانکنا تاکنا میرا مشغلہ بن گیا ہے لیکن اگر عورت اس قسم کی ہو تو میں نظریں کیسے ہٹا سکتا ہوں۔

اس کے لمبے بالوں کی ڈھیلی چٹیا اس کے کاندھوں پر پڑی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ اس کی بچی مسلسل رو رہی تھی اور وہ اسے چپ کرانے میں مگن تھی۔ اس کا بڑا بچہ اس کے شوہر کی گود میں بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ میں صرف اس کی پشت دیکھ رہا تھا۔ اف خدایا! پشت نے ہی مجھے ڈس لیا تھا۔ وہ پیچھے سے بالکل اجلی کی مانند لگ رہی تھی۔ لمحے بھر کو تو میں نے سوچ لیا کہ شاید اجلی ہی ہے اور اب اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پاکستان واپس جا رہی ہے--- یہ میری اجلی ہے--- ہاں--- اگر میری اس کی شادی ہوتی

تو آج وہ بھی ایسی ہی بھرپور عورت ہوتی۔ میرے بھی دو بچے ہوتے۔ ہم بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کر رہے ہوتے --- ایک دوجے میں مگن --- ایک دوجے میں مگن تو ہم بڑی جلدی ہو گئے تھے۔

میری نئی نئی پوسٹنگ ساہیوال ہو گئی تھی۔ ماں کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ گھر سے باہر جا رہا ہو تو ماں ہزار قسم کی نصیحتیں اور تشویشیں پلو میں باندھ دیتی ہے۔ میری ماں کو بھی میری بہت فکر تھی یہ کہ میں ایک خاص انداز سے رہنے کا عادی ہوں۔ اسپیشل قسم کا ناشتہ مجھے پسند ہے۔ کھانے میں فلاں فلاں چیز ہو۔ کمرے کا ماحول یوں ہو۔ ان سب باتوں میں دراصل میری ماں کا دخل تھا اور میں ماں کی عادتوں کا عادی ہو گیا تھا، کیسے نہ ہوتا؟

ابو جی نے جاتے سمے مجھے کہا تھا: ''بیٹا! زندگی کا تمام سکھ ماں کے قدموں میں تلاش کرنا۔''

ابا جی کو اچانک ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں میٹرک میں پڑھتا تھا اور بڑا ضدی اور نٹ کھٹ بچہ تھا۔ ابا جی میری عادتوں سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے گھنٹہ بھر مجھے ہسپتال میں اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ تھپتھپاتے رہے اور دھیمے دھیمے یوں میرے کانوں میں اپنی باتوں کا رس ٹپکاتے رہے جیسے بکری اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے۔

''بیٹا! ماں اس دنیا میں سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑی عظمت ہے۔ تم اس دنیا میں جو کچھ بھی حاصل کرو گے، ماں کے توسط سے حاصل کرو گے۔ زمین پر اگر ماں کو خوش رکھو گے تو آسمان پر خدا خوش ہو گا۔ ماں ایک دعا دے گی، اللہ تعالیٰ دس اور سن لے گا۔ ماں تمہارے کاموں پر مسکرائے گی تو اللہ تعالیٰ زندگی بھر تم پر کامیابیوں اور نعمتوں کے پھول نچھاور کرے گا۔''

میں ابا جی کی شاعری کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس لیے حیرت سے ان کے زرد ہوتے ہوئے چہرے اور جھاگ جھاگ ہونٹوں کو دیکھتا رہا۔ بڑی لغو باتیں لگ رہی تھیں مجھے یہ۔

پھر ابا جی بولے: ''جوان بیٹا ماں کا سب سے بڑا آسرا ہوتا ہے --- اس کے بڑھاپے کی بیساکھی ہوتا ہے --- جوان بیٹا شفیق اور تابع ہو تو عورت اپنی بیوگی کا غم بھول جاتی ہے۔''

میں نے گھبرا کر ابا جی کے چہرے کی طرف دیکھا --- تو ان کا چہرہ اور زرد ہو گیا۔

بولے: ''زندگی میں سب سے بڑی خوشی جو تم ماں کو دے سکتے ہو وہ یہ ہے کہ اپنی زندگی اپنی ماں کے حوالے کر دینا۔''

''زندگی'' میرے ہونٹ لرزے --- ''ہاں زندگی کہتے ہیں زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کو --- اور سب سے بڑا فیصلہ شادی کا فیصلہ ہوتا ہے۔'' مجھے یک بیک پسینہ آ گیا۔ سولہ سال کا لڑکا بھلا شادی کے بارے میں کیا سوچ سکتا ہے۔

''وعدہ کرو فضیل!'' ابا جی نے میرا ہاتھ اور سر تھام کر کہا۔ ''تم اپنی شادی اپنی ماں کی پسند کے مطابق کرو گے۔''

میں نے بے سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔

وہ بولے ''زبان سے اقرار کرو۔'' میں رونے لگا۔ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور گلوگیر آواز میں، میں نے کہا:

''وعدہ کرتا ہوں کہ شادی اپنی امی کی پسند سے کروں گا۔''

''یہ کتنا واہیات وعدہ ہے۔'' میں نے دل میں سوچا۔ ایک ننھے بچے سے جس کی آرزوئیں ابھی انگڑائی لے کر جوان بھی نہ ہوئی ہوں، جانے ابا جی کو آج کیا ہو گیا تھا۔ میں نے ابا جی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا تا کہ آنسو صاف کر سکوں تو اچانک ابا جی کا ہاتھ میری گود میں یوں ڈھلک گیا جیسے وہ ہاتھ نہ تھا، بے جان پتھر تھا۔ میں سراسیمہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔

ابا جی کو ہلایا جلایا --- مگر ابا جی اپنا وعدہ لے کر جا چکے تھے۔

ابا جی کے جانے سے میں یکا یک بالغ ہو گیا۔ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن آئی۔ پھر اسی اعزاز کے ساتھ ایم ایس سی بھی کیا۔ ایک بات مجھے ہمیشہ یاد رہی، ماں کی خوشنودی۔

ماں کی خوشنودی کا اعجاز بھی میں نے دیکھا کہ ہر قدم پر باری تعالیٰ نے مجھے نمایاں کامیابی عطا کی۔

میں اور بھی ماں کے قدموں میں جھکتا چلا آیا --- ماں کی دعا اتنی بڑی سفارش تھی کہ جب میں تعلیم ختم کر کے نوکری کی تلاش میں نکلا تو اتنا مہربان قسم کا باس مل گیا جس نے مجھے ملازمت کے لیے چن لیا بلکہ میری رہائش کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔

جب میں ساہیوال جانے کی تیاری کر رہا تھا تو امی بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار ہم ماں بیٹا ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ امی مجھے یوں نصیحت کر رہی تھیں جیسا میں ننھا بچہ ہوں اور پہلی بار میلہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ ماں ہمیشہ بیٹے کو ننھا بچہ ہی سمجھتی ہے۔

''میرا تو جی چاہتا ہے، اب تیری شادی کر دوں۔'' امی بولیں: تو اپنے آپ کو وہاں نہ سنبھال سکے گا۔''

''آپ کی مرضی امی۔'' میں نے شرارت سے کہا۔ ''مجھے کون سی اپنی مرضی سے شادی کرنی ہے۔''

''اے تو ایک بات پکڑ کر بیٹھ گیا ہے۔ میں کہاں سے ڈھونڈوں گی تیری دلہن۔ خود ہی ڈھونڈ کے مجھے بتا دینا۔''

''دیکھو امی۔ مجھے اس قسم کی شہ نہ دو۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے لڑکی پسند کر لی تو آپ رو رو کر برا حال کر لیں گی۔''

''پگلا!'' امی نے مجھے چپت مارا۔ ''میں کیوں ایسا کروں گی۔ میں خودغرض ماں نہیں ہوں۔ لے آج میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں، جس کو تو پسند کرے گا، میں اس کے ساتھ ضرور تیری شادی کر دوں گی۔''

''پکا وعدہ ہے امی---!'' میں نے ہاتھ بڑھایا۔

امی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولیں ''یہ ایک ماں کا وعدہ ہے لعل! تیری شادی تیری پسند سے ہوگی اور میں اپنے ہاتھوں سے کروں گی۔''

میں نے جھک کر امی کے قدم چھو لیے۔ ماں اور باپ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ شاید ابا جی بھی نہیں جانتے تھے کہ ماں کا سینہ کتنا فراخ ہوتا ہے۔ ماں ایک سمندر ہوتی ہے۔ صحرا کی وسعت ہے اس کے کمزور اور بیمار دل میں۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے میں اپنی ماں کی مرضی جانے بغیر لڑکی پسند کرلوں۔ کبھی ایسا موقع آیا تو پہلے آپ کو لڑکی دکھاؤں گا۔''

''اور میں اس لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی۔''

امی کی آنکھوں میں عظمت اور سچائی کے چراغ جل رہے تھے۔ مجھے ان کی زبان کی صداقت پر یقین آ گیا مگر مجھے یہ ایک ناممکن سی بات لگ رہی تھی کہ کوئی لڑکی میری نظر میں آئے گی۔ ماؤں کے لاڈلے سپوت بگڑے ہوئے بچے ہوتے ہیں، جھکنا نہیں جانتے، ہمیشہ دوسرے کی پیش قدمی کے منتظر رہتے ہیں۔

مگر کبھی کبھی ناممکن ممکن ہو جاتا ہے اور محبت ایک طوفانی جذبہ ہے جو احساسات و جذبات پر لگے ہوئے سارے قفل توڑ کر نکل جاتا ہے۔ اس کا احساس مجھے تین ماہ بعد ہی ہو گیا۔

عرفان صاحب نے کہا تھا جب تک مجھے رہنے کو گھر نہیں ملتا، ان کے عزیز کے ہاں ٹھہر

سکتا ہوں۔ تین ماہ بعد مجھے دو کمروں کا ایک خوب صورت گھر مل گیا تھا۔ اپنا سامان وہاں رکھنے کے بعد میں نے امی جان کو فون کیا تھا اور پھر شام کو تیار ہو کر عرفان صاحب کے ہاں چلا آیا تاکہ آج ان کی نوازشات کا شکریہ ادا کروں۔

عرفان صاحب تو گھر پر نہیں تھے، البتہ ایک خوبصورت بلا نے مجھ پر سحر کر دیا۔

وہ انتہائی لمبے بالوں والی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اچانک ڈرائنگ روم کی بتی گل ہو گئی تھی۔ وہ شمع دان ہاتھ میں اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

اگر گھپ اندھیرے میں اچانک روشنی ہو جائے اور آپ دیکھیں کہ لمبے لمبے کھلے بالوں والی، موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والی چاندنی جیسی سفید سطح والی نرم و گداز لڑکی ہاتھ میں شمع پکڑے روشنی کے ہالے میں آپ کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ ہاں جی وہی ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہو گیا۔ جیسے من کے سارے کواڑ کھل گئے اور اندر باہر روشنی کی کرنیں لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ جب میں کافی دیر تک مبہوت سا اسے دیکھتا رہا تو اس نے آہستہ سے شمع دان میز پر رکھ دیا اور بولی:

”ڈیڈی ابھی آتے ہوں گے۔ ان کا فون آیا ہے۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ اسی طرح بیٹھا رہا، تو پھر بولی:

”کیا آپ انتظار کر سکیں گے؟“

اب کے بھی کوشش کے باوجود میری زبان نہ کھل سکی تو پھر بولی:

”میرا نام اجالا ہے، میں عرفان صاحب کی بیٹی ہوں۔“

”اجالا۔۔۔!“

تب میں چونکا، مسکرایا، اپنے آپ میں آیا اور ہمت کر کے بولا۔

”آپ تو ایسا اجالا ہیں جو تن من کے اندھیرے دور کر دیتا ہے۔“

''جی!'' وہ جاتے جاتے گھومی اور میں نے اس کے بے انتہا لمبے، خوبصورت اور چمکدار کھلے بال دیکھے۔ اف خدایا۔

گھٹائیں کیسی ہوں گی؟

ناگ کسے کہتے ہیں؟

سیاہ رات کے طلسمی اندھیرے میں ان سیاہ ناگوں نے مجھے ڈس لیا۔ میں ایسا مبہوت سا بیٹھا تھا۔ جب مرد بت بن جائے تو عورت شوخ ہو جاتی ہے۔ اس کو معلوم ہو گیا۔ وہ مجھ پر بجلی گرا چکی ہے۔ اس لیے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی رہی، ہنسی کے گھنگھرو بجاتی رہی۔ جب وہ بڑے دروازے کے قریب پہنچی تو اچانک بتی آ گئی۔ سارا ہال کمرہ روشن ہو گیا۔

میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔

اب مبہوت ہونے کی اس باری تھی۔

میں ماں کا لاڈلا، مکھن اور دودھ سے پلا ہوا، چھ فٹ سے اونچا، صحت مند جاذب نظر نوجوان تھا۔ میری شخصیت ایسی نہ تھی کہ وہ متاثر ہوئے بغیر گزر جاتی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں وہ جذبہ دیکھا جسے ہار جانے والا جذبہ کہتے ہیں، پھر وہ بھاگ گئی۔

رات سونے سے پہلے میں نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا:

''ماں! آج مجھے پتہ چلا کہ عورت کیا ہوتی ہے۔۔۔! عورت ایک آگ ہے اور جوانی کا پیراہن کاغذی ہوتا ہے، جلدی جل جاتا ہے اور ماں تو خداوند کا پرتو ہوتی ہے۔ ٹھنڈی، میٹھی، شفیق، سایہ دار، خوشبودار۔۔۔

عورت اور ماں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس رات مجھے معلوم ہوا اور محبت کیسی لذت ہے۔ میں نے جانا۔۔۔ اور مائیں کیوں جوان اولاد کی شادی پر اصرار کرتی ہیں۔ نئے نئے

جذبے میرے دل میں سر اٹھانے لگے اور میں بہانے بہانے سے عرفان صاحب کے گھر جانے لگا۔

''عجیب بات ہے ''اجلی'' عرفان صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کے لیے وہ کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھے۔ میں نے اچھا رشتہ بن جانے والی ساری ادائیں انہیں دکھائیں۔ دکھاتا کیوں نہیں؟ روز شام کو جب میں وہاں جاتا‘ گیٹ کے پاس اپنے کھلے بالوں کے ساتھ‘ ہاتھوں میں موتیے کے پھول پکڑے اجلی مجھے منتظر ملتی۔ سب گھر والے اسے اجلی کہتے تھے اور وہ اتنی ہی صاف‘ پاک‘ دھلی دھلائی مصفا سی لڑکی تھی۔

پہلی بار جب میں چھٹی لے کر گھر گیا تو ماں کے چہرے کی بشاشت دیکھ کر حیران ہو گئی‘ پھر میری رہائش کے بارے میں ہزاروں سوال پوچھتی رہی۔

بعد میں‘ میں نے کہا ''ماں! عرفان صاحب بہت اچھے ہیں۔''

ماں نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بڑے سبھاؤ سے بولی۔

''عرفان صاحب اچھے ہیں یا ان کی بیٹی اچھی ہے۔''

''ماں---!'' میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ماں کو اپنے ہزاروں سوالوں کا جواب کتنی جلدی مل گیا تھا۔ میں نے سوچا۔

شاید اپنی اور بہت سی خدائی صفات کے ساتھ ساتھ اللہ میاں نے ماں کو غیب کا علم بھی دے دیا ہے۔

''ماں! تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ایسے ہی تو تم روز عرفان صاحب کے گھر نہیں جاتے۔ میں جانتی ہوں مگر بتاؤ تو لڑکی کیسی ہے؟''

''بہت خوبصورت ہے ماں۔''

''کیا نام ہے؟''

''اجالا!''

''نام تو خوبصورت ہے۔''

''خود بھی ہے ماں؟''

''بس جوانی میں نظر تو صرف خوب صورتی تک ہی جاتی ہے۔''

''کیا مطلب ہے ماں؟''

ماں ہنسنے لگی۔

''میں آپ کو لڑکی دکھاؤں گا۔''

''دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بتاؤ رشتہ مانگنے کب جاؤں؟''

''ماں! رشتہ تو فوراً مل جائے گا۔'' میں نے ماں کی گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''عرفان صاحب مجھے پسند کر چکے ہیں۔ بس پہلے تم آ کر اجلی سے مل لو۔''

''میں جانتی ہوں۔ سب مرحلے تو طے ہو چکے ہیں۔ اجلی بھی تمہیں پسند کر چکی ہے۔ اب دیر کیوں لگاتے ہو؟''

''اچھا ماں--- اس بار تم میرے ساتھ چلو۔ وہاں لڑکی سے بھی مل لینا اور اس کے بعد رشتے کی بات پکی کر لینا۔''

''تم کل جاؤ، میں اگلے ہفتے آ جاؤں گی۔''

ماں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اگلے ہفتے ماں آ گئی۔ میں نے شام کے سرسراتے اندھیرے میں اجلی کا نرم و گداز گیلا گیلا ہاتھ تھام کر کہا۔

''اجلی! انتظار کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ تم نے درختوں کی اوٹ سے جھانک جھانک

کے مجھے بہت تڑپایا ہے۔ جانتی ہو شادی کے بعد تمہیں کتنا پیار دوں گا۔"

"کتنا۔۔۔؟"

"اتنا پیار دوں گا کہ تم میرے پیار کے بوجھ سے مر جاؤ گی۔"

اجلی زور زور سے ہنسنے لگی۔

"دیکھو! اگر تمہاری ماں نے مجھے پسند نہ کیا تو......؟"

یہ ہم ماں بیٹے میں پہلے سے طے ہے۔ ہمارے ہاں محبت پر پہرے نہیں بٹھائے جاتے۔ میری ماں دو دلوں کے بیچ کبھی نہیں آئے گی۔

"اجلی! اگر میں تمہیں نہ چاہتا تو زندگی ادھوری ہوتی۔ چاہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے ایک اور جہاں دریافت کیا۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔

"تم بات بات میں نہ ہنسا کرو اجلی۔ میں بڑا انتہا پسند ہوں اور جب تم میری محبت کی انتہا کو پاؤ گی تو تمہیں پتہ چلے گا اور میرا مذاق اڑاؤ گی تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔"

اجلی میری گرفت سے نکل کر دور بھاگ گئی۔

"کل صبح امی کو لاؤں گا۔"

میں نے چلا چلا کر کہا اور آ گیا۔

دوسری صبح میں امی کو لے کر ان کے ہاں پہنچا۔ انہوں نے ہمارا اسی طرح سواگت کیا جس طرح شرفاء اپنے ہونے والے سمدھیوں کا کرتے ہیں۔

خوب خاطر مدارت، محبتیں۔۔۔خوش خلقیاں، میری امی بے تابانہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ تب بیگم عرفان نے خود ہی اجلی کو آواز دے ڈالی۔ اجلی تو پہلے ہی اندر آنے کو تیار بیٹھی تھی، بس ذرا مجھے تڑپانا چاہتی تھی، پھر جب گلابی سوٹ میں ملبوس لمبے گیسوؤں

کے ہالے میں چاند ایسا گلابی چہرے جھکائے اندر داخل ہوئی تو میں نے صاف پڑھ لیا۔ اس کے چہرے جوانی کے گرم ارمانوں کا اجالا بکھرا ہوا تھا محبت سوز بن کر اس کے چہرے پر سایہ کیے ہوئے تھی اور اس میں سے ایک آنچ ایسی اٹھ رہی تھی جو بہاروں کا پیراہن جلا ڈالتی ہے۔ امی نے اجلی کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اور وہ امی کے پہلو میں یوں گھس کر بیٹھ گئی جیسے اس نے مجھے میرے حق سے محروم کر دیا ہو۔ تب میں نے سوچا، یہ لڑکیاں کس قدر چالاک ہوتی ہیں۔ ساس کے دل تک پہنچنے کا راستہ انہیں خوب آتا ہے۔

پھر ہم سب مل کر باتیں کرتے رہے، مسکراتے رہے--- بالکل ایسے جیسے ایک گھر کے افراد ہوں۔ ایسے لگتا تھا، ہم سب نے ایک دوسرے کو آمناً وصدقناً کہہ کر قبول کر لیا ہے۔

کھانے کے وقت عرفان صاحب بھی آ گئے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد میں چلا آیا کیونکہ اب بزرگوں نے سر جوڑ کر رشتے کی بات کرنا تھی، حالانکہ جو کچھ نظر آ رہا تھا، اس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ ہر ایک دل میں رشتہ سو فیصد طے ہو چکا ہے--- مگر رسم دنیا کو نبھانا بھی تھا۔

رات کو جب میں دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر سیٹیاں بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو امی جان مصلے پر بیٹھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میرے تو قدم زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ اس سانسوں کے سرگم پر پیار کی دھن بجاتا ہوا امی کے پاس سے نکل گیا۔ امی نے سلام پھیر کے مجھے آواز دی اور بولیں:

''بیٹا! تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں آنا۔''

''اچھا امی!'' میں جا کر شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے لگا--- مجھے معلوم تھا، امی کیا کہنے والی ہیں۔

یہی کہ فلاں تاریخ منگنی کے لیے ٹھہری ہے، فلاں مہینے میں شادی ہوگی۔ شادی میں یہ کچھ ہوگا--- وغیرہ وغیرہ لوگ شادی کو خوامخواہ ایک گورکھ دھندا بنا دیتے ہیں، حالانکہ سیدھے سادھے طریقے سے نکاح کر کے لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے۔

کتنی بے شمار باتیں میں نے ایک دم سوچ لیں۔ جی میں آیا ذرا ابھی جا کر اجلی کو فون کر کے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی جائے---مگر پھر یہ سب مجھے امی جان کے منہ سے سننا اچھا لگا کیونکہ اس دنیا میں زمین پر ماں کو اپنا خدا سمجھتا تھا۔

امی جب نماز سے فارغ ہوئیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں ان کے پیچھے اندر آ گیا اور جا کر ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرے کان محبت کے بارآور ہونے کی کہانی سننے کو بے تاب تھے۔ اس وقت میں دو عورتوں کے درمیان کھڑا تھا اور میں نے صاف محسوس کر لیا کہ ماں بھی اگرچہ محبت کا ایک ٹھنڈا میٹھا چشمہ ہوتی ہے مگر اس چشمے سے صرف روح سیراب ہوتی ہے۔

وہ محبت کا تیز و تند دھارا جو محبوبہ کی صورت میں سامنے آتا ہے، زندگی کا رخ موڑ کے رکھ دیتا ہے۔ جوان آدمی کو آگ کی ضرورت ہوتی ہے، ٹھنڈک کی نہیں۔

میں نے بہت دیر انتظار کر کے امی کے چہرے کی طرف دیکھا---تو امی کے چہرے پر دور دور تک ویرانیاں چھائی ہوئی تھیں، بڑی سنجیدہ شکل بنا کر گویا ہوئیں۔

”بیٹا! ماں باپ کبھی اپنا دل چیر کر اولاد کو نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے اولاد کو کبھی یہ علم نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں---؟“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں امی؟“

میں نے ہنس کر پوچھا۔

''تمہیں یاد ہے، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ شادی میری مرضی سے کرو گے۔''

''جی ہاں اور میں اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہوں۔'' میں نے بلا کی خود اعتمادی سے کہا۔

''تو بیٹا! تم اجالا سے شادی نہیں کرو گے۔''

''آپ مذاق کر رہی ہیں امی۔''

''نہیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں میرے بچے۔''

''یہ کس طرح ہو سکتا ہے امی؟''

''ایسا ہی ہو گا میرے لعل۔''

''امی! یہ تو ظلم ہے۔''

''ماں سے کیا ہوا عہد بھی توڑنا ظلم ہے۔''

''امی۔۔۔امی۔۔۔!''

''بس بیٹا اور کچھ نہ کہو۔''

''کیا یہ آپ کا حکم ہے؟''

''ہاں، حکم ہی سمجھ لو۔''

''مگر وجہ تو بتا دیں امی۔''

''بیٹا! جس طرح تم نے وہ وعدہ کر لیا تھا، اس طرح آج یہ بھی ارادہ کر لو کہ اس کی وجہ مجھ سے نہیں پوچھو گے اور نہ میں بتا سکوں گی۔''

امی کا بت میری نظروں سے گرا اور چور چور ہو گیا۔ ماں اتنی خود غرض، ظالم اور انا پرست بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سب جانتی ہے کہ میں اجالا کے آگے تن من کی بساط ہار چکا ہوں۔ اس کو علم ہے کہ میری خوشی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اس کو معلوم ہے کہ میں شریف لوگوں کا ایک خاموش

زبان دے چکا ہوں۔

ان سب مرحلوں سے کیسے گزرا جائے گا۔ عرفان صاحب کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔ اجلی سے کیا کہوں گا، جسے میں نے مست قلندر عاشق بن کر دیکھا ہے--- دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوگئی اور میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میں نے ابا جی اور پھر امی سے اس قدر فضول وعدہ کرلیا تھا--- آخر وعدے لینے کے معاملے میں والدین اس قدر خود غرض کیوں ہوتے ہیں؟

مگر فضیل، ہاں تم اپنی ماں کو ہی خدا سمجھتے تھے۔

سمجھتا تھا تو میری بھول تھی۔ خدا اتنا ظالم، خود پسند اور خود بیں نہیں ہوتا۔

میں نے اپنے دوستوں کے ذریعے امی پر دباؤ ڈالا--- سب جتن کرکے ہار گیا۔ وہاں ایک ہی نا--- آخر کب تک ٹال مٹول کرتا۔

ایک دن اجلی کو یہ خبر مل گئی۔

وہ چپ چپ رہنے والی اور بالوں کو گھٹاؤں میں مسکرانے والی لڑکی چپکے سے میرے گھر آ گئی، اور پھر اس طرح جیسے ساون کی گھٹا کھل کر برستی ہے۔

پہلے تو وہ روئی--- اس کے آنسو صاف کہہ رہے تھے--- تم نے میرے دل میں محبتوں کو جگایا، درد بسایا۔ میں تو منہ بند کلیوں کی طرح سو رہی تھی، تمہارے جنون نے مجھے عشق سے آشنا کیا۔ تم نے میرے دل کو تمنا کا لہو چٹایا، تم مجرم ہو--- پاپی ہو--- بزدل ہو--- یہ ہوتی ہے محبت کی انتہا۔

جب میں نے اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی تو وہ بپھر اٹھی۔ وہ یوں بولی جیسے کالی گھٹاؤں کے بیچ کہیں بجلی کڑکتی ہو۔

"وعدے سب ایک سے ہوتے ہیں فضیل--- ماں سے کیا جائے یا محبوبہ سے ماں

کے وعدے کا تمہیں اس قدر پاس ہے اور دل کے وعدے کو بھول رہے ہو۔‘‘

’’اجلی --- اجلی --- تمہیں کیا معلوم میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔‘‘

’’ڈائیلاگ نہ بولو ---!‘‘ اس نے غصے سے کہا۔ ’’مجھے جلدی پتہ چل گیا۔ تم گھٹیا انسان ہو --- بزدل ہو --- ماں کے اشاروں پر چلنے والے آدمی کبھی اچھے شوہر نہیں ہوتے --- میں تمہاری محبت پر تھوکتی ہوں۔‘‘

’’اجلی!‘‘ میں نے اٹھ کر اس کا راستہ روک لیا ’’خدا کے واسطے ذرا سوچو --- یہ حالات تمہارے ساتھ پیش آ سکتے ہیں --- میری محبت اور میرے خلوص پر شک نہ کرو۔ اتنا غصہ نہ کرو --- مجھے تھوڑا سا موقع دو۔ میں اپنی امی کی ضد توڑ دوں گا۔ انہیں منا لوں گا‘ اپنا وعدہ واپس لے لوں گا۔ انہیں ایسا کرنا ہو گا ---!‘‘

’’چھوڑ دو مجھے ---!‘‘ اس نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ’’میں زندگی بھر ایک ڈرامہ نہیں کھیلنا چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر ماں اپنے بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو جائے تو بہو کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ ایسے گھر میں جانے سے بہتر ہے جہنم میں چلی جاؤں‘ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تم دونوں کے درمیان گیند بن کر اچھلتی رہوں۔‘‘

وہ چلی گئی --- وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا --- اور اپنی ماں مجھے اس مکار چڑیل کی طرح نظر آ رہی تھی جو حسن پری کا روپ دھار کر آتی ہے اور سوتے ہوئے لوگوں کے کلیجے نکال کر لے جاتی ہے۔

ابھی میں --- ذہنی کیفیت کی توڑ پھوڑ سے ہی گزر رہا تھا کہ ایک دن مجھے اجلی کی شادی کا کارڈ ملا --- یہ حرکت اجلی نے غصے میں کی تھی۔ وہ اپنے ایک کزن سے شادی کر رہی تھی جو فوج میں تھا اور جسے اجلی سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس نے ایک روز مجھے بتایا تھا۔

’’اور تو کسی طرف سے خطرہ نہیں۔‘‘ اس نے کہا تھا۔ ’’صرف خالہ رضیہ کی طرف سے

خطرہ ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ ایک عرصے سے سلمان کے لیے آس لگائے بیٹھی ہیں اور امی کی محبوب بہن ہے۔"

"اور تم---؟"

"اور میں---" اجلی ہنس پڑی۔ "اور میں سلمان سے بچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ امی یقیناً یہ پوچھتیں کہ کون ہے وہ جس کے لیے اس کو ٹھکرا رہی ہو۔"

"اچھا کون ہے وہ---؟" میں نے پرشوق انداز میں پوچھا تھا۔

"مرد کس قدر خود پسند ہوتا ہے۔" وہ اٹھلائی۔ "جانتے ہوئے بھی سب عورت کی زبانی سننا چاہتا ہے۔"

"مرد کی بھی عورت کی طرح یہ تمنا ہوتی ہے' کوئی اسے چاہے' سراہے--- محبت کا دم بھرے--- اس کے عشق میں مبتلا رہے--- اور میں تو ایک بگڑا ہوا بچہ ہوں۔ مجھے تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔ مجھے لڑنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ ماں نے یہ سب مجھے نہیں سکھایا۔ اگر تم سکھا دو گی تو ضرور لڑوں گا۔"

"مگر کیوں؟"

"جب تم سلمان کا نام لیا کرو گی؟"

"اللہ قسم فضیل! مجھے زہر لگتا ہے' بچپن ہی سے برا لگتا ہے۔ اگر کبھی میں سلمان کا نام لوں تو تم سمجھنا میرا زہر کھانے کو جی چاہا ہوگا۔"

سو اس نے اس طرح زہر کھا لیا۔ سلمان کی صورت میں وہ ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔

جذباتی بھی تھی --- اس میں بچپنا بھی تھا --- وہ میرے منہ پر طمانچہ مارنا چاہتی تھی --- سو مار دیا۔

اور اب میرے لیے اس دنیا میں کیا رہ گیا تھا؟

خفت، ہزیمت --- فرقت --- عداوت۔

میں ان دریاؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ دنیا سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ دل میں ہمہ وقت الاؤ بھڑکا کرتے --- اور امی سے انتقام لینے کو جی چاہتا۔

ہاں، اس ماں سے جس نے اباجی کے بعد مجھے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ جنہیں قدم قدم پر سجدہ روا سمجھا تھا اور جن کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو میں اپنا ایمان سمجھ لیا کرتا تھا۔

اور اس سے بڑا کوئی انتقام نہیں تھا کہ اس عمر میں اپنی ماں کو یکہ و تنہا چھوڑ جاؤں۔ میں اجلی کی شادی کی خبر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس لیے میں نے نوکری چھوڑ دی اور ماں کی گود، رفاقت اور محبت کو ٹھکرا کر امریکہ چلا آیا۔ میں نے اپنی ماں کو نہ بتانے کی زحمت کی اور نہ اجازت لینے کی ضرورت سمجھی۔ میرا ایک دوست شبیر امریکہ میں رہتا تھا، بس اس کو خط لکھا اور راتھ کر چلا آیا۔

لوگ کہتے ہیں، ممتا ظالم ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں عشق ظالم ہوتا ہے --- جوانی میں عشق دل و جگر کو یوں پھونک ڈالتا ہے، جیسے آگ خشک لکڑیوں کو۔

میرے جیسا ضدی آدمی جب فیصلے کی آن پر قربان ہو جاتا ہے تو ہر جذبہ اس کے آگے فنا ہو جاتا ہے۔

میں نے شبیر کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ شبیر نے میرے اس اقدام کو سراہا نہیں تھا اس نے کہا تھا:

''ماں کو اس قدر چاہنے والے بچے سے اس اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

وہ گاہے گاہے مجھے سمجھاتا بھی رہتا تھا۔

مگر میری گاڑی جب انتقام کی لال پٹڑی پر چل نکلی تو کوئی اس کو روک نہ سکا۔ میں نے نیو یارک میں کام تلاش کر لیا اور زندگی کا انداز ہی بدل ڈالا۔

ہر وہ لڑکی جو میرے قریب آئی، میں نے اسے پامال کیا۔ میں نے اپنی زندگی کو شراب کباب اور فضولیات کے حوالے کر دیا۔ میں اپنی بے داغ روح کو اس قدر داغ دار کر لینا چاہتا تھا کہ میری ماں بھی میرا چہرہ نہ پہچان سکے۔ جس نازوں پالے چاند اور سورج بچے پر اسے ناز ہے، وہ اس کا فخر مٹ جائے، ختم ہو جائے۔ اسے احساس ہو کہ اس کی تربیت میں کہیں کھوٹ تھا، غلطی تھی۔

میں اب ایک بدلا ہوا فضیل تھا۔

میں نے اپنی ماں کو کبھی خط نہں لکھا۔ مجھے معلوم تھا۔ مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی میری ماں مر جائے گی اور یہی اس کی سزا بھی ہونی چاہیے۔

کہ ایک دن میری ماں کا خط آ گیا۔

ان پانچ سالوں میں یہی میری ماں کا پہلا خط تھا۔ جانے اس نے میرا پتہ کہاں سے اور کیسے لیا تھا۔ میں نے شبیر کے مجبور کرنے کے باوجود اس خط کا جواب نہیں دیا، بلکہ اپارٹمنٹ بدلنے کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر ماں کا دوسرا خط آیا --- ماں منت کر کے مجھے بلا رہی تھی، اونہہ --- جیسے میلا کھلونا توڑ کر بچے کو بہلایا جاتا ہے اور اب میں واپس جانے کے قابل رہا ہی کب تھا۔

میں اپنی ضد پر اڑا رہا کہ ماں کی طرف سے تار موصول ہوا۔

''ماں کی حالت نازک ہے۔'' تو کیا ہے --- میں نے سوچا --- مرنے سے پہلے ہر

ماں کی حالت نازک ہوتی ہے--- نازک نہیں ہوگی تو جائے گی کیسے---؟

لیکن ایسے میں شبیر ہمارے درمیان آ گیا- اس نے اپنے پیسوں سے میرا ٹکٹ خریدا اور یوں مجھے بھیجا جیسے پاکستان کی طرف منہ کر کے مجھے دھکا دے دیا ہو--- اب آئے بنا کوئی چارہ ہی نہیں تھا-

* * *

میری نظریں ابھی تک اس خاتون پر ٹکی تھیں--- اور اس کا شوہر بار بار مجھے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا- دو ایک بار بڑے غصے سے اس عورت نے مجھ مڑ کر دیکھا تھا، میں معاملے کی نزاکت تک نہ پہنچ سکا- اس کے بالوں پر نظریں جما کر ماضی کے اندھیروں میں کہیں کھو گیا تھا- اس نے مڑ کر دیکھا تھا- وہ ہرگز اجلی نہ تھی- نہ اجلی کی طرح حسین و طرح دار تھی- بس ایک عورت تھی- لمبے بالوں والی، لیکن شاید میری آوارہ نگاہ میں اتنی غلاظت بھری تھی کہ کوئی بھی عورت میری نگاہ برداشت نہ کر سکتی تھی--- پیشتر اس کے کہ اس کا شوہر لپک کر آتا اور میرا گریبان پکڑ لیتا--- میں نے اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا-

جہاز میں رات اتر آئی تھی- کچھ مسافر اونگھ رہے تھے اور کچھ سرہانے کی بتیاں جلا کر کتابیں پڑھ رہے تھے- میں نے بھی اپنے تھیلے میں سے ایک نخش سا ناول نکالا اور پڑھنے لگا

پڑھتے پڑھتے میرا خیال--- بھولے بھٹکے بچے کی طرح ماں کی طرف دوڑ گیا- ان پانچ سالوں میں، میں نے واقعی ماں کی خبر نہ لی تھی-

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا- اس عرصے میں میری ماں نے وقت کس طرح گزارا ہوگا- اس کا کفیل کون تھا؟ یہ تو ٹھیک ہے کہ ابا جی نے انہیں ایک مکان اور کچھ دکانیں بنوا دی تھیں جن کے کرائے پر وہ گزر بسر کرتی تھیں--- لیکن ساری بات گزر بسر کی ہی نہیں ہوتی- ایک ضعیف عورت کو سو قسم کے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے--- اور اپنی اولاد کے سوا کون سہارا

بنتا ہے؟

انہوں نے بیوگی میں مجھے پالا --- کیا کیا تکلیفیں نہ اٹھائیں' میری خاطر --- اور کس ناز سے مجھے پالا --- مجھے چاہا۔

انہیں حق پہنچتا تھا کہ اپنی ایک بات مجھ سے منوالیں۔ کیا میں نے ایسی ماں کے منہ پر ٹھوکر مار کر اپنی دین و دنیا تو خراب نہیں کیے۔

''نہیں۔'' میرے اندر کی رعونت نے جواب دیا۔ ''ایک بوڑھی ماں کو کیا حق پہنچتا ہے' اپنے جواب بچے کی ذین و دنیا بگاڑنے کا۔''

ایسی ماؤں کو یہی سزا ملنی چاہیے۔

جب میں اپنی بگڑی ہوئی شکل لے کر اپنی ماں کے پاس جاؤں گا' تو مجھے بہت خوشی ہوگی تب میں کہوں گا ماں! اس صورت کو بگاڑنے میں سراسر تیرا ہاتھ ہے۔

خدا خدا کر کے یہ طویل سفر تمام ہوا۔ رات کے دو بجے ہم کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچے اور صبح سات بجے دوسرے پلین سے مجھے لاہور جانا تھا۔ میں دوسرے مسافروں کے ساتھ مڈوے ہاؤس کی طرف چلا تو میں نے دیکھا' وہ لمبے بالوں والی خاتون اپنے شوہر کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ کر جا رہی تھی۔ اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''میں سب عورتوں سے نفرت کرتا ہوں۔ اے عورت!''

میں نے اپنے دل میں کہا۔ ''میری نگاہ وہ نہیں کہ جس میں طلب ہوتی ہے۔ یہ انتقام کی نگاہ ہے۔''

لاہور ایئرپورٹ سے میں نے ٹیکسی لی اور گھر کو روانہ ہوا۔ میرا شہر بالکل نہیں بدلا تھا۔ اپنے شہر کو دیکھ کر دل پر اداسیوں کی رم جھم بارش ہونے لگی۔ جب میں ماں کے کمرے میں

داخل ہوا تو میری ماں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی سامنے بستر پر لیٹی تھی اور ایک میلی کچیلی نوکرانی اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ میں نے قریب جا کر ماں کو پکارا اور کہا:

''امی! میں آ گیا ہوں۔''

میری آواز سن کر ماں کے چہرے پر بہار آ گئی۔

ماں مجھے دیکھ کر بے تاب ہو گئی اور پھر اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو اس نے میری پیشانی چوم لی۔ جب میں نے تکیوں کا سہارا دے کر ماں کو بٹھایا تو مجھے ماں پر ترس آ گیا۔ یہ تنومند، خوش خلق اور خدمت گزار ماں ہرگز نہیں تھی، مگر میرے اندر جو روٹھا ہوا بچہ تھا، وہ ابھی تک تنا تنا سا تھا۔ مجھے فوراً ماں کی زیادتی یاد آ گئی اور یہ کہ میں ماں کو معاف کرنے کی نیت سے نہیں آیا تھا۔

چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ماں میرا حال پوچھتی رہی --- پھر بولی۔

''جاؤ، نہا دھو کر کپڑے بدلو۔ پھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

میں اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس طرح صاف لقا کپڑے وارڈ روب میں لٹکے ہوئے تھے۔ جوتوں پر پالش تھی، حتیٰ کہ میز پر وہ کتابیں اور کاغذ بھی اسی طرح پڑے ہوئے تھے، جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا میرے بعد میرے کمرے کا مجھ سے زیادہ دھیان رکھا گیا ہے، جیسے میں ابھی یہیں ہوں۔ اسی میں بستا ہوں۔ میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا تو مجھے خیال آیا کہ میں ماں کے لیے کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ لانا چاہیے تھا۔ دنیا داری اور زمانہ سازی کی خاطر ہی سہی۔

مگر کیوں ---؟

ماں نے مجھے کون سا تحفہ دیا ہے۔ پالا پوسا، تو یہ اس کا فرض تھا۔ کچھ زیادہ مراعات دیں تو یہ اس کی ذاتی مجبوری تھی۔ میں اکیلا جو تھا --- اور بہن بھائی ہوتے تو وہ ان فضول قسم کی

مراعات کی متحمل نہ ہو سکتی۔

میں اپنے آپ سے لڑتا ہوا باہر نکل آیا۔

اب میری ماں تکیے کا سہارا لے کر خود ہی بیٹھی تھی۔ وہ میلی کچیلی نوکرانی جا چکی تھی۔

''تم نے کچھ کھایا؟''

''جی۔۔۔!'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

ماں نے میری طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا اور کہا ''تمہاری صحت ٹھیک نہیں لگتی۔''

حالانکہ کثرت شراب نوشی سے میرا جسم پھول گیا تھا مگر آنکھوں کے گرد حلقے ضرور تھے اور میرا رنگ بھی پہلے جیسا دودھیا سفید نہ رہا تھا۔ بہر حال مائیں ہمدردی جیتنے کے لیے ایسے سوال ضرور کرتی ہیں۔

میں نے۔۔۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ انتظار کرنے لگا کہ اب امی گلے شکوے کی پٹاری کھولیں گی۔ پانچ سال میں جو کچھ گزرا' اس کی دردناک داستان سنائیں گی۔ کچھ ممتا کا واسطہ دیں گی اور کچھ مجھے شرم دلائیں گے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اور میں اس صورت حال کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ امی نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک پرانا اخبار تہہ کیا ہوا نکالا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس میں ایک خبر ہے' دیکھ لو۔''

عجیب احمقانہ خواہش تھی۔ میں نے تہہ کیا ہوا اخبار کھولا۔ سب پرانی سرخیاں تھیں۔ دیکھتا رہا۔۔۔ تو ایک دم ایک کونے میں میری نظر گئی۔ ایک حادثے کی خبر تھی لکھا تھا:

''میجر سلمان کی کار ٹرک سے ٹکرا گئی۔'' نیچے حادثے کی تفصیل اور تصویر بھی تھی۔''

''میجر سلمان اپنی بیوی اجالا سلمان اور دو بیٹیوں کرن اور پون کے ساتھ مالا کنڈ سے آ رہے تھے۔ راستے میں ان کی کار ایک اینٹوں والے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ اس حادثے میں میجر سلمان کو بے شمار چوٹیں آئیں۔ انہیں سوات کے ہسپتال پہنچا دیا گیا مگر وہاں پہنچنے تک انہوں نے دم توڑ دیا۔ ان کی بیوی اور بچیوں کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

تو یہ اجالا تھی --- میرا سارا خون ایک دم میرے چہرے کی طرف دوڑا۔ میری اجلی بیوہ ہو گئی --- لٹ گئی تھی۔ میری وجہ سے برباد ہو گئی تھی --- اس نے خود اس حادثاتی شادی کو گلے سے لگایا تھا۔

ساری دنیا میری نظروں میں گول گول گھومنے لگی۔

مگر امی نے یہ خبر مجھے کیوں پڑھوائی تھی ---؟ میرے زخم کریدنا چاہتی تھیں --- میرے چھالوں میں سوئیاں چبھونا چاہتی تھیں۔ مجھے گھر بلا کر میرے تڑپنے کا تماشا دیکھنا چاہتی تھی --- اب انتقام لینے کی ان کی باری تھی۔

کیا خوب بدلہ لیا تھا اور کس طرح مجھے گھر بلایا تھا۔ آتے ہی اتنی بڑی خوش خبری میری جھولی میں پھینکی تھی۔ میں نے اپنے غصے میں بھری نگاہ امی کے چہرے پر ڈالی تو وہ اپنی نحیف آواز میں بولیں۔

''ماں باپ کبھی اپنا دل چیر کر اولاد کو نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے اولاد کو کبھی یہ علم نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟''

میں آگ بگولا ہو گیا۔ یہ فقرہ سالوں پہلے ماں نے ایسے ہی موڑ پر کہا تھا اور اب اس ڈرامے کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے اخبار کو مروڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اپنا غصہ پینے کی کوشش کرنے لگا۔ امی بولتی چلی گئیں۔

میں نے اجالا کو دیکھا تو وہ مجھے بہت پسند آئی - وہی نہیں اس کا سارا گھرانا مجھے اچھا لگا - وہ واقعی بڑے شریف النفس اور بھلے مانس لوگ تھے - اجالا میں کوئی عیب نہ تھا مگر میرے بیٹے --- میری نگاہ اس کی پیشانی پر گئی تو پھر وہیں اٹک گئی - اس کی پیشانی پر ایک نشان موجود تھا جو ایسی عورتوں کی پیشانی پر ہوتا ہے جو جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں - میرا ایمان ہے کہ غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر بوڑھی آنکھیں اور تجربہ کار دل جو کچھ دنیا سے سمیٹتا ہے --- اس کا کوئی مول نہیں --- بعض واہمہ یا شک دل کے اس قدر قریب آ کے کھڑا ہو جاتا ہے کہ آدمی دل کے پٹ موند لیتا ہے - کوئی ماں جو جوانی میں بیوہ ہو گئی ہو، نہیں چاہتی کہ اپنی بہو کی بیوگی کو بھی دیکھے - جب کہ اس کی متاع اول و آخر صرف اس کا بیٹا ہو، جس کو اس نے چاند تاروں کی طرح پالا ہو -

میرے جی میں یہ وہم آ گیا تھا - اگر اس وقت میں تمہیں یہ بات کھول کر بتا دیتی تو تم بپھر اٹھتے، مجھے چیلنج کرتے - جاہل اور احمق کہتے اور جانے کیا کیا کہتے، اور پھر ضد میں آ کر اجالا سے شادی بھی کر لیتے -

''بیٹا! کوئی ماں خود غرض نہیں ہوتی - ہر ماں کی ذاتی غرض اس کا بچہ ہوتا ہے --- بچے کے آگے پوری کائنات ہیچ ہے -''

''تم ماں کے جذبات کیا جانو ---؟''

''تم مجھ سے خفا ہو کر اتنی دور چلے گئے جہاں میری فریاد بھی تم تک نہ پہنچ سکتی -''

''میں اس امید پر تمہاری جدائی کا صدمہ جھیل لیا کہ ایک نہ ایک دن تمہیں ماں کی سچائی پر یقین آ جائے گا --- تمہارا غصہ دور ہو جائے گا اور تم خود ہی آ جاؤ گے - اسی اثناء میں بے چاری اجالا کے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا - تب سے اب تک میں تمہیں ڈھونڈتی رہی - آخر مجھے تمہارا سراغ مل گیا - میں نے قسمیں دے کر تمہیں یہاں بلا لیا ہے -''

امی رک گئیں--- شاید وہ میرے منہ سے کچھ معذرت کے جملے سننا چاہتی تھیں، مگر میں دانستہ نہیں بولا-

میرا دل صاف نہیں ہوا تھا-

دم لے کر وہ پھر گویا ہوئیں:

"چاند بیٹے---! ماں عجیب قسم کی مخلوق ہوتی ہے- اولاد کے لیے اللہ سے بھی الجھ پڑتی ہے- میں بھی اللہ سے مسلسل لڑتی رہی ہوں- میں نے اللہ سے مہلت مانگی تھی کہ وہ مجھے صفائی کا موقع دے- مجھے تمہاری اس بے معنی خفگی کا بھی گلہ نہیں اور نہ تمہاری سرد مہری کا شکوہ ہے- والدین اور اولاد میں یہی فرق ہوتا ہے- یہ خوشی ضرور ہے کہ جانے سے پہلے اللہ نے مجھے صفائی کا موقع دے دیا-

بیٹا! اب تم اپنی دکھیا ماں کی خوشنودی کے لیے ایک اور کام کر دینا- اجالا کے پاس جانا- وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہے- اس کی عدت ختم ہو چکی ہے- پہلے تو میری طرف سے اس سے معافی مانگ لینا-

بیوہ عورت ایک پھوڑا ہوتی ہے، میرے بچے!

ذرا کوئی سختی سے پیش آئے تو دکھ جاتی ہے- اس کے سر پر کوئی ہاتھ نہیں رکھتا- تم جاؤ، اس کے سر پر ہاتھ رکھ دو- اس کی بچیوں کے باپ بن جاؤ- ان بچیوں کو تمام عمر یہ نہ محسوس ہونے دینا کہ ان کا باپ کوئی اور تھا-

محبت ایک روحانی جذبہ ہے پیارے بچے---!

محبت--- جسم، صورت اور وقت سے آزاد ہوتی ہے-

محبت اندھی ہوتی ہے- وہ جسم پر لگی خراشیں نہیں دیکھتی، کیونکہ وقت بڑا ظالم ہے- جب اس کا پہیہ چلتا ہے تو ہر جسم و ذہن پر کچھ خراشیں آتی ہیں-

اگر تم نے اجالا سے محبت کی تھی تو جاؤ اسے اپنا لو --- اپنانے اور احسان کرنے میں بہت فرق ہے۔ بکھری ہوئی عورت کو احسان نہیں، محبت سمیٹ لیتی ہے۔

مرد خود غرض ہے۔ وہ عورت کے کسی اقدام کو معاف نہیں کرتا۔ تمہیں میری قسم تم اجالا کو اس طرح بازوؤں میں سمیٹ لینا جس طرح اس نے ابھی ماں کے بطن سے جنم لیا ہو اور یہی عشق کی انتہا بھی ہے۔

جاؤ۔ اس کو بتاؤ ایک انتہا پسند مرد کا عشق کیا ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر امی جان تھک گئیں، پھر تکیہ ہٹا کر لیٹ گئیں، ستانے لگیں۔ انہوں نے ایک سانس میں بہت سی باتیں کر لی تھیں۔

پہلے میں نے نظریں جھکائیں --- پھر سر جھکا لیا --- سر جھکایا تو اٹھا نہ سکا۔

مجھے اپنے آپ سے اتنی شرم آئی کہ بیٹھے بیٹھے میں تحت الثریٰ میں اتر گیا --- اور نیچے --- اور نیچے --- مجھے اپنا آپ اتنا گندہ اور بدبودار لگا کہ جیسے میں غلاظت کا ایک ڈھیر ہوں اور میرے اندر سے تعفن اٹھ رہا ہے۔

بھلا میرے جیسے گھٹیا اور غلیظ انسان نے اتنی عظیم ماں کی کوکھ سے کیسے جنم لیا؟ یہ کیسے ہو گیا میرے معبود!

میں نے اپنے آپ کو کھینچ کھینچ کر تحت الثریٰ سے نکالا اور ڈرتے ڈرتے ماں کے قدموں کی طرف دیکھا --- اور سر ان کے قدموں میں رکھنے سے بیشتر ایک بار میں نے اپنی ماں کے شفیق چہرے کی طریف دیکھنا چاہا --- اور میرے خدا --- !

ان کے چہرے پر نور کا ایک ہالہ تھا۔

وہ تو کب کی جا چکی تھیں --- !

امرتی

(افسانہ)

پیاری ماں! مجھے معاف کر دینا۔ میں ڈھنگ سے تیرا سوگ بھی نہیں منا سکی ورنہ میرا خیال تھا، جب تو مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی، تو میں زمانے سے منہ موڑ لوں گی---مگر زمانہ تو ہر بار زندوں اور مردوں کے درمیان آ حائل ہوتا ہے۔

میں نے سوچا تھا---سوا مہینہ دنیا کا ہر کام چھوڑ دوں گی۔ سارا دن کلام پاک پڑھا کروں گی۔ ہار سنگھار کو ہاتھ نہ لگاؤں گی۔ ہر وہ کام کروں گی جس سے میری ماں کو ثواب پہنچے---وہ جو جی کو اور بہت سے روگ لگے ہیں، وہ بھی تیرے نام پر لگا دوں گی۔ جی بھر کے رو لوں گی۔ روٹھ لوں گی۔ خفا ہو لوں گی۔

مگر یہ زمانہ ہے--- یہ زندگی ہے--- یہ تو سلیقے سے سوگ بھی نہیں مناتے دیتی۔
کل تیرا سوئم ہوا ہے اور آج میں یوں بیٹھی ہوں جیسے کبھی تیرے نام سے آشنا ہی نہ تھی۔

تو کون تھی---؟

تو کیا تھی---؟

ماں! دیکھ تو بھلا میں یوں بیٹھی ہوں جیسے کسی ماں نے مجھے جنا نہ ہو۔ ازل سے دھرتی پر بیٹھی ہوں۔ ابد کا انتظار دیکھنے کے لیے۔ آج صبح اٹھ کر کام میں یوں جت گئی تھی جیسے کوئی بیگار کیمپ کا آدمی بن کہے مشقت پر لگ جاتا ہے۔

صبح ہی صبح اٹھ کر میں نے سارے گھر کے فرش دھوئے، سفید چاندنیاں اٹھا دیں۔ لوبان اور اگر بتی کو کوڑے کے کنستر میں پھینک دیا۔ باہر کمرے میں پلنگ بچھا کر ان پر خوش نما پلنگ پوش ڈال دیئے۔ ڈرائنگ روم کو نئے سرے سے سجایا، بنایا، گھر کو گھر بنا دیا اور میلے کپڑوں کا بڑا گھٹڑ لے کر باہر نل پر دھونے بیٹھ گئی۔ یوں لگتا تھا، ان تین دنوں میں لوگوں نے کپڑے بدل بدل کر مجھ سے سارے بدلے لے لیے ہیں۔

تین دن سے میری ساس ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ وہ گھر کے اس سوگوار ماحول سے اکتا گئی تھی۔ اور پرسے کو آنے والے لوگ اسے زہر لگ رہے تھے۔ جب بھی کوئی ہو کر جاتا۔ سر اٹھا کر کہتی:

''ان کم بختوں کے تو آنے کا کوئی وقت ہی نہیں۔ کھانے کے وقت بھی منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ گھر نہ ہوا، قبرستان ہو گیا۔ توبہ توبہ۔ یہ ماتمی صفیں اٹھاؤ۔ میرا تو لوبان کی بو سے دم گھٹتا ہے۔ اتنے دن سوگ کرنا مذہب میں کتنا گناہ ہے۔ اٹھاؤ سب کچھ بس۔ بس وہ اپنی پوری عمر گزار گئی ہے۔ کون سی جوانمرگ گئی ہے۔''

اور سچ پوچھو تو ماں! کپڑوں کا بڑا سا گھٹڑ دھونے کے بعد میں اس قدر تھک چکی تھی کہ مجھے بھی ان تعزیت کرنے والیوں کا آنا جانا اچھا نہیں لگا۔ جو دو چار کپڑے رہ گئے تھے، وہ چھوڑ کر آ گئی۔ مگر دھیان انہی کی طرف لگا رہا۔ ایک بار اٹھ جاؤ تو دوبارہ بیٹھنے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ ادھر کھانے کا وقت ہو رہا تھا اور مجھے سارے گھر کے لیے پھلکے پکانے تھے۔

دور بیٹھی میری ساس دہائی دے رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی۔ ماں مرنا ایک رسم کیوں ہے؟ اور اس رسم کو یوں نبھایا کیوں جاتا ہے۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے، تیرا آنا ایک کہانی بن گیا ہے۔

پرسوں گھر مہمانوں سے بھرا تھا اور تیرا تن ایک خالی پنجرے کی طرح سفید چادروں

میں لپٹا ہوا تھا۔ ساری عورتیں لمحہ بھر کو میرے پاس آ کر بیٹھتیں۔ تسلی کے دو بول کہتیں اور پھر اٹھ کر پرے چلی جاتیں۔

''ہاں جی، ماں بڑی نعمت ہوتی ہے۔''

''بڑی شے ہے جی ماں۔''

''ماں کا بدل کون ہو سکا ہے۔۔۔؟

''مانواں ٹھنڈیا چھانواں!''

بازار میں بکنے والی چیزوں کی طرح یہ فقرے ان کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے۔

بوڑھیاں بات کرنے سے پہلے ایک ٹھنڈی سانس بھرتیں، گویا انہیں اپنے ہی منہ سے ادا کیے جانے والے فقرے میں اپنا مستقبل نظر آ رہا ہو۔ اور جوان عورتیں ان فقروں کی گیندیں یوں اچھالتیں جس طرح کرکٹ کا مشاق کھلاڑی گیندیں ادھر سے ادھر پھینکتا ہے۔ جوان عورتیں سمجھتی ہیں، بڑھاپا ان سے بہت دور ہے۔ ایسے میں نوعمر بچیاں یوں سارا تماشا ٹک ٹک دیکھا کرتی ہیں جیسے یہ فانی جہاں تو ان کا جہان ہے ہی نہیں۔ حقیقت میں وہ خوابوں کے لافانی جہان میں رہتی ہیں۔

اماں! میں ان باتوں کا کیا جواب دیتی۔ جب آنسو زبان بن جائیں تو قوت گویائی سلب ہو جاتی ہے۔

اماں مجھے چپ لگی تو جیسے ادراک کے در وا ہو گئے۔ باہر کی روشنیاں بجھتی ہیں تو ایک جہان اندر روشن ہو جاتا ہے۔

ساری عورتیں ایک آدھ روایتی فقرہ کہنے کے بعد دور جا بیٹھی تھیں۔ پرسہ دینے والے فقرے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ ایک آدھ فقرے کی ادائیگی کے بعد ہی انسان تھک جاتا ہے، پھر وہ اپنی زبان کو لوہے کے ان شہتیروں سے آزاد کر کے ادھر ادھر کی زندگی کی ہلکی پھلکی

باتیں کرنے لگتا ہے۔

وہ عورتیں جلدی مجھ سے دور چلی جاتیں اور ان کا---موضوع سخن بھی بدل جاتا۔ اماں! میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ وہ اپنی پہلی زچگی سے لے کر آخری تک ایک ایک تفصیل مزے لے لے کر ایک دوسرے کو بتا رہی تھیں۔ وہ پہلی رات سے لے کر اپنی ساس کے چٹیا پکڑنے تک کے تمام حربے بیان کر رہی تھیں۔ بچوں کی ولادت کو روکنے کے نئے اور مجرب و آزمودہ نسخے ایک دوسرے کی جھولی میں ڈال رہی تھیں۔

ویسے عورتوں کو میں نے اس لیے جمع کیا تھا کہ کلام پاک پڑھ کر تیری روح کو ثواب پہنچائیں گی اور کھجوروں کی گھٹلیوں پر کلمہ طیبہ کا ورد کریں گی تا کہ تیری قبر میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پہنچیں تو تجھے اندازہ ہو اچھی اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔ مگر یوں لگتا ہے ماں کسی کی ماں کو کوئی بھی ٹھنڈک نہیں پہنچانا چاہتا۔ سیپارے پڑھتی پڑھتی عورتیں سر اٹھا کر باتیں کرنے لگتیں اور گھٹلیاں پھینکتے پھینکتے انہیں کئی دلچسپ واقعات یاد آ جاتے جو وہ ایک دوسرے کو سرگوشیوں میں بتائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ایسے میں بہت سی عورتیں نکل آتی ہیں جنہوں نے سپارہ نہیں پڑھنا ہوتا۔ اس لیے وہ الگ منڈلی بنا کے بیٹھ جاتی ہیں اور کئی ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں ڈاکٹر نے زمین پر بیٹھنے کی ممانعت کی ہوتی ہے۔ وہ کوئی گدی منگواتی ہیں یا کرسی کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ماں! ڈر ہے ایسی عورتوں کو اگر ڈاکٹر نے مرنے کے بعد زمین میں دفن ہونے سے پرہیز بتا دیں---تو وہ کیا کریں گی؟

آخر سونے روپے میں تو کوئی دفن نہیں ہو سکتا نا؟

میرے پاس بھی ایک ایسی عورت بیٹھی تھی۔ چہرہ قریب کر کے بولی۔ ''میں تو اتنی دیر زمین پر نہیں بیٹھ سکتی۔ بس آپ کی والدہ کا سنا تو میں آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرش پر بیٹھنے سے منع کیا ہے۔''

پھر وہ ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدل کے کسی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئی۔ باتوں میں انہیں پرہیز کا خیال نہیں آیا۔ ماں! ویسے اگر کچھ پڑھنے کو کہا جائے تو انہیں ڈاکٹر صاحب کی ہدایات یاد آ جاتی ہیں۔

ایسے موقعوں پر بہت سی عورتوں کو ان مہلک امراض کی فہرست یاد ہوتی ہے جن کی وجہ سے انہوں نے بے شمار لوگوں کو مرتے دیکھا ہوتا ہے۔ پھر وہ چٹخارے لے لے کر یوں ان کی روداد بیان کرتی ہیں، جیسے ان پر تو کبھی سکرات کا وقت نہ آئے گا۔

ہاں یہ تو ایک ابتدائی فقرہ ہوا نا؟

''کیا ہوا تھا ان کو---؟''

''اسے کیا ہونا تھا---؟'' میری ساس دور بیٹھی اپنی سوکھی سڑی بانہوں میں سونے کا چوڑا پہنے ہاتھ نچا نچا کر بتا رہی تھی۔

''بڑھاپے میں کچھ ہونا نہ ہونا تو محض ایک بہانہ ہوتا ہے۔ بس جانے کا بہانہ--- کیا ہونا تھا اس کو--- ساٹھ سے اوپر ہو گئی تھی۔ بچے بیاہ لیے تھے۔ پوتوں نواسوں والی ہو گئی تھی۔ کیا اب بھی نہ جاتی؟ اور کتنا جی لیتی، دو سال، چار سال، اچھا ہی ہوا چلی گئی۔ مفلوج ہو کر جینے سے بہتر ہے آدمی آرام سے قبر میں جا لیٹے۔''

میری ساس خیر سے ساٹھ سے اوپر ہی ہے مگر ذرا سا پیٹ میں اپھارہ ہو جائے تو دس ڈاکٹر بلا لیتی ہے۔ پھر ہر عیادت کرنے والے سے التجائیہ انداز میں کہتی ہے۔

''میری صحت و تندرستی کے لیے دعا کریں۔ اللہ کے ہاں کسی چیز کی کمی ہے۔ اللہ مجھے نواز بیٹے کے سہرے کے پھول دکھائے۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے؟''

میرا بیٹا جو دس سال کا ہے، دادی اماں کو اس کے سہرے کے پھول دیکھنے کا ارمان ہے۔ سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں جن لینے کے باوجود انہوں نے ابھی دنیا میں دیکھا کچھ

نہیں۔ ہر بہو کے سینے پر سانپ بن کر لوٹتی ہیں اور ہر داماد کو اپنی بیٹی کی نتھ ڈالی ہوئی ہے۔ اس پر بھی کیا کسر نفسی ہے کہ تیسری نسل دیکھنا چاہتی ہیں۔

''ہاں بہن! بڑھاپا سب سے بڑی بیماری ہے۔ مرضِ الموت ہی کہیے۔'' کسی دوسری عورت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اچھا ہوا مر گئی۔'' میری ساس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ ''ایسا مریض تو خوامخواہ بوجھ بن جاتا ہے۔''

پتہ نہیں میری ساس کس مرض میں جائے گی۔ اسے خود اس کا علم نہیں۔

میں نے ٹک ٹک ایک ایک کا چہرہ دیکھا چہرے دل کے آئینے نہیں ہوتے یا پھر سارے آئینے جھوٹے ہوتے ہیں۔ اب اصلی چیز تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں، اسی لیے تو تجھے کفن میں لیٹے دیکھ کر بھی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ تو مر گئی ہے۔ ماں! یوں لگتا تھا، ابھی تو اٹھ جائے گی۔ ابھی تیرے تنفس سے مردہ کفن دھڑک اٹھے گا۔

سچی بات بتاؤں۔۔۔! کوئی زندہ آدمی یہ نہیں چاہتا کہ مردہ جاگ اٹھے۔ جو مر جائے اس کے ساتھ دنیا کا ناطہ فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر وہ جوڑنا چاہے تو اس کی بھول ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں کہ صرف اپنا دم لے کر جانا ہے۔۔۔ یہ اولاد۔۔۔ اولاد کے لیے جھگڑے ناانصافیاں، جھوٹ، جائیدادیں جس طرح بھی بنائی جاتیں۔ یہیں رہ جاتی ہیں اور اولاد، ماں، والدین کس قدر جھوٹ بولتے ہیں اس اولاد کے لیے۔ کس قدر ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ یہ اولاد تو ایک سیپارہ پڑھ کر بھی انہیں بخشنے کی روادار نہیں ہوتی۔

ماں! میں لاشعوری طور پر خوفزدہ تھی کہ تو زندہ ہو کر اٹھ کھڑی نہ ہو۔

کیا میں اتنی کٹھور ہو گئی تھی۔۔۔؟

نہیں ماں۔۔۔!

اب تجھ سے اپنی مجبوریاں کیا چھپاؤں۔

میں تجھے ہسپتال سے گھر تو لے آئی مگر مجھ پر اس ڈیڑھ مہینے میں کیا بیت گئی، وہ میں تجھے نہ بتا سکی۔

ماں! اس دنیا کے قانون بڑے ظالم ہیں۔ تیرے یا میرے رو دینے سے یہ ظلم کے نشان ختم نہیں ہو جائیں گے۔

بھائی لوگ تو تجھے ہسپتال میں داخل کر کے رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے سعادت دارین حاصل کرنے کے لیے تجھے تھوڑی سی بھیک بھی دے گئے۔

مگر چھ مہینے تک میں نے ہسپتال میں جس طرح تیری دیکھ بھال کی ہے، وہ میرے سوا اور کون جان سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تجھے جنرل وارڈ میں لاوارثوں کی طرح رہنا پڑتا تھا۔

تیرے وارث کہاں تھے ماں؟

مجھے بھی گھر کے سارے بکھیڑے نمٹا کر ہی ہسپتال میں جانے کی اجازت ملتی تھی۔ ہسپتال جانے کے لیے مجھے گھر میں اوور ٹائم لگانا پڑتا تھا کہ کہیں میری ساس میرے شوہر کے کان نہ بھر دے اور ساس ہی کیا --- سبھی لوگ یہ کہتے تھے کہ ایک عورت جو ساٹھ سے اوپر ہو چکی ہو اور کینسر کی مریض ہو، اسے مرنے میں دیر نہیں لگانی چاہیے۔ اس طرح وہ اپنے علاوہ دوسرے کا بھی وقت ضائع کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ دن آن پہنچا جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا۔ ''اسے اب گھر لے جاؤ۔''

اصل میں ڈاکٹروں کا مقصد ہوتا ہے کہ اب اسے اگلے جہان میں بھیجنے کی تیاریاں شروع کر دو۔ مگر بڑے خلوص سے گھر بھیج دیتے ہیں کہ گھر میں سکون سے موت آ جاتی ہے۔ ہسپتال میں موت راستہ بھول جاتی ہے کہ وہاں اور بھی مریض ہوتے ہیں۔

تو ماں! میں بادل ناخواستہ تجھے اپنے گھر لے آئی کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ تو

چند دن کی نہیں، چند گھڑیوں کی مہمان ہے اور چند گھڑیوں کے مہمان کو تو پھولوں میں رکھتے ہیں۔ ماں گھر میں اگرچہ اتنی جگہ نہیں تھی، مگر میرے دل میں تو جگہ تھی نا؟ میں نے بچوں کا کمرہ تیرے لیے صاف کر دیا۔ تیرے سرہانے نرگس کے پھول رکھے کہ نرگس کے پھول ہمیشہ انتظار کرتے ہیں۔ ان میں وصل کی نہیں، جدائی کی خوشبو ہوتی ہے اور تجھے گود میں لے کر یوں دوا پلانے لگی جیسے تو میرا اپلوٹھی کا بچہ ہو۔

کہ تو جانے والی تھی۔

جانے اس دنیا سے کیا لے کر جا رہی تھی۔

سب کو تیرے ساتھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ سبھی تیری عیادت کو یوں آئے جیسے کلیوں کی راہ میں پھول چومنے آتے ہیں۔ اتنی آہستگی اور نرمی سے تیرا حال پوچھتے کہ مجھے تجھ پر رشک آنے لگتا۔

اور پھر دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے، تو سب کا رویہ اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا۔ ماں وہ کھڑے کھڑے عیادت کرنا بھول گئے۔ وہ تجھے یوں دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں:

''یہ سب فراڈ ہے۔''

''بڑھیا جانے کی نہیں۔''

''بہانے سے آسرا ڈھونڈ رہی تھی، آسرا مل گیا تو کیوں جائے۔''

میری ساس کے سر میں مسلسل درد رہنے لگا۔ میرے شوہر ہر رات کو دیر سے آنے لگے۔ میں آواز بلند کر کے ان کے دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھ سکتی تھی کیونکہ ہر بات کے ڈانڈے میری ماں سے جا کر مل جایا کرتے تھے۔

بچوں کو بات بات پر مار پڑنے لگی۔

کبھی گھر میں سالن ٹھیک نہ پکتا اور کبھی گھر کی صفائی میں کیڑے نظر آنے لگے، ماں!

جب تک کوئی انسان زندہ ہو اسے غذا' لباس اور دوا کی ضرورت رہتی ہے۔ موت کے انتظار میں بھوک پیاس اڑ تو نہیں جاتی۔

میں نے گھر کے خرچے میں سے پائی پائی جوڑ کر پانچ ہزار روپے جمع کیے تھے جو میری الماری کے سب سے نچلے خانے میں اخبار کے کاغذوں کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک ایک لال نوٹ کھسکانا شروع کر دیا تاکہ تیرے لیے پھل اور دوائیاں آ سکیں تاکہ گھر میں ہمیشہ سے اچھا کھانا پکتا رہے' تاکہ گھر کے ہر فرد کو پھل ملتا رہے۔ کوئی تیری بیمار وجود کو طنز کی برچھیوں سے نہ چھید دے۔

ماں! مجھے بچپن ہی سے آویزے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ جوانی کی اولین محبت کی طرح ہر عورت تھوڑی سی رقم بچا کر رکھتی ہے۔ وہی اس دنیا میں اس کا مستقبل بن جاتی ہے۔

میں نے اپنا زادسفر لٹانا شروع کر دیا۔

ماں! موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بھلا کوئی بیٹی بھی اپنی ماں کے مرنے کی دعا مانگ سکتی ہے۔ خواہ گھر کی فضا تنی تنی سی ہو' گھر ہر آئے سے میری ساس کہتی:

''اچھے خاصے گھر کو ہسپتال بنا ڈالا ہے۔''

ماں! تو نہیں--- دراصل میں جانکنی کی حالت میں تھی۔ تو تو بڑی مطمئن تھی۔ خاموش تھی۔ آہٹ پر کان اور نظریں لگائے بیٹھی تھی۔ تجھے پتہ تھا کہ تجھے جانا ہے--- جانے والے تو صرف اپنے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں نا؟

پھر جب ان سرخ نوٹوں میں سے پورے ایک سو پچاس نوٹ خرچ ہو چکے تو تو نے آخری ہچکی لی۔

ماں میں پھوٹ پھوٹ کر روئی' کس لیے؟

کیا اس لیے کہ میں نے تیرے مرجانے کی دعائیں مانگی تھیں۔

کیا اس لیے کہ میں تیرے بوجھ سے تھک گئی تھی یا اس لیے کہ میں جیون کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی تھی۔

ماں! بتا نا؟ میں بھلا کیوں روئی؟ اس طرح چیخ چیخ کر اور بلک بلک کر کیوں روئی۔۔؟

تو تو عورت ہے، بتا۔۔۔ جب ماں کی لاش بیٹی کے گھر پڑی ہو اور ماں کے بیٹوں کو علم بھی نہ ہو کہ ان کو خون جگر پلانے والی چلی جا رہی ہے، تو کیا جذبات ہوتے ہیں، ماں؟

میں نے سارے بھائیوں کو تار دلوائے، عزیزوں کو خبر ہوئی۔ موت کی خبر تو آناً فاناً ہوا پر سفر کرتی ہے۔

ماں! میں نے کچھ اور سرخ نوٹ نکالے اور تیری تجہیز و تکفین کے لیے دے دیئے کہ اس سمے جب تیرا آخری ڈولا تیار کیا جا رہا تھا، میں اپنے شوہر سے رحم کی بھیک نہیں مانگنا چاہتی تھی۔ میں تجھے آخری سفر پر عزت و آبرو سے بھیجنا چاہتی تھی۔

ماں! میرے سوا کوئی نہیں رو رہا تھا۔ یہ ماں بیٹی کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے۔

پھر سب تجھے لے گئے۔

کیا تجھے کسی کا انتظار نہیں تھا؟

مجھے اپنے بھائیوں کا انتظار تھا ماں۔ رات کو بڑے بھائی آ گئے جو خیر سے بڑے افسر ہیں۔ کہیں دور پار سرحد پر تھے۔ اس لیے آنے میں دیر ہوئی۔ میں انہیں دیکھ کر دیوانی ہو گئی۔ جی چاہا لپک کر بھائی جان کے گلے سے لگ جاؤں اور چیخ چیخ کر روؤں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے کلف لگے سینے سے دور کر دیا اور بولے:

''تیرا کیا لے گئی ہے جو اس طرح رو رہی ہے؟''

ماں! کیا تو میرا کچھ لے گئی تھی؟

میں بھائی جان کو کیا بتاتی کہ تو میرا کیا لے گئی ہے۔ کلیجہ لے گئی ہے۔ سب کچھ لے گئی

ہے۔

لوگو! غضب خدا کا۔ ماں مر جائے اور بیٹی نہ روئے۔

دوسری صبح منجھلے بھیا آ گئے۔

دونوں بھابیاں دور کونے میں منہ لٹکائے بیٹھی تھیں اور لوگوں سے یوں تعزیت کروا رہی تھیں جیسے انہوں نے ہی اپنی ساس کی آخری دم تک خدمت کی ہو۔

یہی بھابیاں ہیں، جب انہوں نے سنا تھا کہ ''ماں! تجھے کینسر ہو گیا ہے۔'' تو فوراً ہسپتال میں داخلے کا مشورہ دیا تھا۔ بڑی بھابی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ہماری جگہ جگہ ٹرانسفر ہوتی رہتی ہے۔ ہم کیسے اس کو اٹھائے پھریں گے اور چھوٹی بھابی کے تیسرا بچہ ہونے والا تھا۔ سو ماں! تجھے اپنے داماد کے دروازے پر آ کر مرنا پڑا۔ اب کتنے مزے سے آنسو بہاتی ہیں اور کہہ رہی تھیں: ''ہم نے تو بہت کہا مگر امی جان کا دل ہمارے گھر لگتا ہی نہ تھا۔'' بیٹوں کے مجبور کرنے پر بھی ان کے پاس نہ رہتیں۔''

''بس ان کی جان تو اکلوتی بیٹی میں اٹکی رہتی تھی۔''

مگر یوں لگتا تھا جیسے بھابیوں کے سر سے چھت کا بوجھ اتر گیا ہو۔ سوئم کی رسم تھی اور یہ آخری رسم ہوتی ہے، جو جانے والے کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ اس کے بعد گویا سب کے فرائض کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ اور لوگ اپنے اپنے کام میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بہت دیر تک بھابیوں کا منہ دیکھتی رہی، پھر میں نے اندر سے سرخ نوٹ نکالے اور ختم دلانے کے لیے اپنے شوہر کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ یہ کہہ کر بھائی جان نے دیئے تھے، خیال تھا کہ جاتے ہوئے بھائی جان خود بخود سارا خرچہ مجھے دے کر جائیں گے۔

عورتیں چٹخارے لے کر کھانا بھی کھاتی جاتیں اور زیر لب پوچھتی بھی جاتیں:

''یہ سب کس نے کیا ہے؟''

''پتہ نہیں۔''

''داماد نے کیا ہوگا۔''

''ایسے داماد اللہ سب کو دے۔۔۔!''

''اے داماد کہاں کرتے ہیں، دو جوان بیٹے بھی آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کیا ہوگا۔''

رات کو جب دونوں بھائی رخصت ہونے کو میرے کمرے میں آئے اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو میں نے آنسوؤں کے درمیان انہیں بتایا کہ اب تک اماں پر میرے ساڑھے چار ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔

بڑے بھائی نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیئے اور بولے:

''اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا بی بی! تم نے بہت بڑی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ پانچ سو رکھ لو جب چالیسواں کرو تو اس میں ملا لینا۔''

میں نے حیران ہو کر بھائی جان کی صورت دیکھی۔

وطن کے جیالے کے چہرے پر غیرت کا نشان تک نہ تھا۔

پھر میں نے منجھلے بھائی کی طرف دیکھا۔

''ان کی ضرورت نہیں ہے بھائی جان۔ شاید آپ کے کام آ جائیں۔ آپ بال بچوں والے ہیں۔'' بھائی نے کمال ڈھٹائی سے وہ پیسے دوبارہ جیب میں ڈال لیے۔

میں نے مزید کہا:

''آپ یوں کیجئے کہ اماں کے چالیسویں کا ختم اپنے اپنے گھر میں دلوا دیجئے، اس طرح آپ کو بھی ثواب مل جائے گا۔''

اماں! بھلا مردوں کو بھی کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھلا مردے بھی کچھ مانگتے ہیں۔ یہ سب تو زندہ لوگ اپنی عاقبت کے لیے کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اماں تو چالیسویں وغیرہ سے بے نیاز ہوگئی ہے۔ تجھے جہاں پہنچنا تھا تو پہنچ گئی ہے۔

تو ان بیٹوں کی محتاج کبھی نہ تھی اماں۔ اسی لیے تو ان کا احسان لینا پسند نہ کیا۔

اماں! میں کب تمہیں اپنے دکھڑے سنانے آئی ہوں؟

ابھی تو تیرے اپنے سفر کی تھکان نہیں اتری اماں۔

تیری قبر گیلی ہے اور گیلی قبر پر آنسو بہانا اچھی بات نہیں۔ میں تو یونہی رات کا آنچل اوڑھے معذرت کرنے چلی آئی۔ اماں بھلا دیکھو۔

دنیا تو سوگ بھی سلیقے سے منانے نہیں دیتی۔ چار دن منہ چھپا کر رونے بھی نہیں دیتی۔

اماں۔۔۔ او اماں۔۔۔!

جب غم سے کلیجہ پھٹا جا رہا ہو اور حالات چیخنے کی اجازت نہ دیتے ہوں، چیخیں سینے میں دم توڑ رہی ہوں اور گھر بھر کے لیے کھانا پکانا پڑے۔

جب دنیا سے منہ موڑ کر جانے کو جی چاہ رہا ہو مگر سارے گھر کو چمکا کر صاف ستھرا کرنا پڑے۔

جب خودکشی کرنے کو جی چاہ رہا ہو اور معصوم بچی چلا کر روٹی مانگے۔

اور۔۔۔!

جب دل ریزہ ریزہ ہو رہا ہو اور شوہر کی سیج سجانی پڑے تو پھر کیا کرتے ہیں اماں؟

بددعا

(افسانہ)

سہاگ رات اگر بن آہٹ کے گزر جائے تو دلہن کو تعجب ہوتا ہی ہے۔ نہ صرف تعجب بلکہ رنج، دکھ، صدمہ جو بھی کہہ لیں۔ جو تصور صدیوں سے سرخ کپڑوں کے ساتھ وابستہ چلا آیا ہو اس تصور کے معنی بدلنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔

آمنہ پر بھی یہ پہاڑ پہلی رات ہی گرا۔

جب کسی پر پہاڑ آن گرتا ہے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ آمنہ کے اندر بھی توڑ پھوڑ کا عمل جاری تھا۔ وار کاری تھا۔ جعفر رات گئے اندر آیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سے اس کی بے حسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا، پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا:

''مجھے افسوس ہے......''

''کس بات کا؟''

کافی دیر خاموشی طاری رہی۔

آمنہ کا رواں رواں کان بن گیا۔

وہ کہنے کو الفاظ ڈھونڈتا رہا اور آمنہ سننے کی ہمت مجتمع کرتی رہی۔ آمنہ نے تو ہمت مجتمع کر لی مگر جعفر کو صحیح الفاظ نہیں ملے۔ جوتے اترے، کپڑے بدلے، تکیہ اٹھا کر صوفے پر سونے چلا گیا۔

اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی، مگر پھر بھی آمنہ کچھ سننا چاہتی تھی۔ اندر ہی اندر لاوے کا پکنا پسند نہیں تھا۔ زندگی کے کڑے لمحوں میں جی چاہتا ہے نا...... کہ زلزلہ آ جائے۔ طوفان آ جائے۔ کچھ تو ہو جس سے غیر یقینی اور مبہم فضا ٹوٹے۔

"میں آپ کی توقع کے خلاف کر رہا ہوں---مگر میں مجبور ہوں۔"

فقرے کو توڑ مروڑ کے جعفر نے ادا کر دیا اور منہ پھیر کر سو گیا۔

آمنہ کے گھونگٹ میں آگ لگ گئی۔ گھونگھٹ بھڑ بھڑ جلنے لگا اور نیر جھر جھر بہنے لگے۔ اس نے آنچل کی آگ کو خون کے آنسوؤں سے بجھایا۔ خوب رو چکنے کے بعد اٹھ کر کپڑے بدلے، منہ دھویا اور بستر پر واپس آ گئی۔

جعفر سچ مچ سو رہا تھا۔

وہ کڑیل جوان جس کے ساتھ تین ماہ پہلے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ منگنی پر اس نے جعفر کو جی بھر کے دیکھا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، گورا رنگ، گھنی مونچھیں۔ سیاہ خوبصورت بال، بھرے بھرے ہونٹ، ہاتھ پاؤں مضبوط، چال میں وقار، سوٹ میں لاٹ صاحب لگتا تھا اور شلوار قمیص میں جیالا گبھرو، پیشے کے لحاظ سے وکیل تھا۔ آمنہ نے جب بھی اسے دیکھا، نیا تصور باندھا۔

بس فلموں ہی میں تو اس نے وکیل دیکھے تھے...... پھر کبھی کبھی تنہائی میں سوچا کرتی کہ وہ جعفر سے ضرور پوچھے گی کہ وکیل ہر فقرہ شروع کرنے سے پہلے می لارڈ کیوں کہتے ہیں؟

اور آیا وکیلوں کی فلمی کٹہرے کے باہر عام عدالتوں میں بھی اتنی لمبی تقریر کرنے اور ڈائیلاگ بولنے کی اجازت ہوتی ہے؟

اور ہاں وہ یہ تو ضرور جاننا چاہتی تھی کہ فلموں میں ہمیشہ جج کو ایک ڈمی کی صورت میں کیوں استعمال کرتے ہیں جو گاہے گاہے میز بجا دیتا ہے یا آخری حکم سنا دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے

مقدمے کی ساری کارروائی کا بوجھ ہیرو وکیل نے ہی اٹھا رکھا ہے۔

بھئی یہ جج کس لیے ہوتے ہیں آخر؟

اور اصلی زندگی میں تم کب جج بنو گے؟

کیونکہ اسے سفید کنپٹیوں والے، معمر، مدبر اور باوقار جج بہت اچھے لگتے تھے۔

اور پھر کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچا کرتی کہ جب پہلی رات جعفر کو زیادہ تنگ کرنا مقصود ہوگا تو وہ اسے می لارڈ کہہ کر چھیڑے گی، مگر می لارڈ مزے سے سو رہا تھا۔

جیسے آج اس کی شادی نہیں ہوئی، جیسے کسی نئی نویلی، کانچ کی گوری نے اس کے کاشانے میں قدم نہیں رکھا۔ گویا آج شہنائیاں اس کے آنگن میں نہ بجی تھیں۔

آمنہ پر عذاب کے لمحے زینہ زینہ کر کے اترنے لگے۔

اب اتنی بچی بھی نہ تھی۔ کئی کہانیاں اور واقعات سن چکی تھی۔ ڈھیروں کے حساب سے انگریزی ناول پڑھے تھے اور کتابیں جو کچھ بتا رہی تھیں، آج اس کے الٹ ہو رہا تھا۔

کیا ہوگا۔۔۔؟

کیا ہوگا۔۔۔؟

ٹھک ٹھک اس پر ہتھوڑے برسنے لگے۔

آج کی رات جاگنے کی رات تھی، مگر جلنے کی رات نہ تھی۔ اندیشوں، فکروں اور صدموں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

ساری رات آنسوؤں میں گزر گئی۔

صبح موذن کی آواز اس نے اپنے کانوں سے سنی اور جب اجالا ٹوٹ کر بکھرنے لگا تو اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ باہر جا کر دیکھنا چاہتی تھی، دنیا وہی ہے یا بدل گئی کیونکہ کمرے کے اندر تو اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر سامنے مصلیٰ پر بیٹھی ہوئی اپنی ساس پر گئی۔ ملگجے اجالے میں پہلے تو ایک ہیولا سا نظر آیا‘ مگر جب اس نے اپنی دکھتی ہوئی آنکھوں کو اچھی طرح کھول کر دیکھا تو سامنے نماز کی چوکی پر اس کی ساس بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز اس نے بھی سن لی تھی‘ اس لیے نظر اٹھا کر دیکھا۔

اور پھر اس کی نظر آمنہ کے چہرے پر پڑ گئی۔

آمنہ نے محسوس کیا کہ ذرا سی دیر کو اس کی ساس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا تھا۔ بوڑھی آنکھوں میں تعجب کی بجلی کوندی تھی مگر وہ سوالیہ نشان بنی آمنہ کو تکے جا رہی تھی اور آمنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا‘ وہ دروازہ بند کر دے یا دروازے میں سے ہٹ جائے...... یا کسی بہانے سے باہر چلی جائے۔ رات کو اتنا سوچ چکی تھی کہ ذہن شل ہو گیا تھا۔ اتنا جاگ چکی تھی کہ اعصاب مردہ ہو گئے تھے...... ایک لمبی جمائی لے کر اس نے دروازے کے پٹ کھول دیئے۔

باہر زمانہ تھا جو بانہیں پھیلائے افواہوں کا انتظار کر رہا تھا‘ اندر اس کی تقدیر سو رہی تھی۔

خود ہی اس کی ساس چل کر اس کے قریب آ گئی۔

دانا تھی۔

تردد سے پوچھا:

’’خریت سے ہو؟‘‘

’’جی......!‘‘

ساس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر جمی تھیں اور آمنہ کا چہرہ دل کا آئینہ بنا ہوا تھا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا جسے جعفر کے خراٹے توڑ رہے تھے۔ سامنے پھولوں‘ کیوں سے لدا پلنگ نظر آ رہا تھا جس پر جعفر نہیں سویا تھا۔ اس کی ساس نے ایک نظر میں

معاملہ تاڑ لیا تھا۔

''غسل کے لیے گرم پانی چاہیے۔''

اس کی ساس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''نہیں۔'' ایک میکانکی انداز میں آمنہ کے منہ سے نکل گیا۔ اسے اپنی جرأت پر حیرت ہوئی اور بڑی خجل مندی سے اس نے ساس کی طرف دیکھا۔

''باہر آ جاؤ۔''

شادی کی ساس نے آہستہ سے کہا۔

ادی کے تھکے ہارے مہمان ادھر ادھر بکھر کر سو رہے تھے۔

آمنہ دھیرے دھیرے، مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور نماز والے تخت کے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

ساس نے کلام پاک کا وہ صفحہ ختم کیا، دعا مانگی...... قرآن کریم کو چوم کر جزدان میں لپیٹا، پھر اٹھ کر اسے طاق میں رکھ دیا...... اور سامنے بیٹھ کر آمنہ کے منہ پر پھونک ماری۔

اس پھونک سے آمنہ کو بڑی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ جیسے روشنی اور ہوا کی جانب ایک کھڑکی کھلی ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پپوٹے ایک دوسرے سے ملے تو جلن کا احساس بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنی ساس کے سینے سے لگ کر خوب روئے ورنہ اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

آنکھیں کھولیں تو ساس جا چکی تھی۔

اس نے سر کرسی کے ساتھ ٹکا لیا۔ بادِ سحری کے ٹھنڈے جھونکے اس کے تپتے ہوئے جسم کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے لگے۔ صبح کا رنگ سفید ہونے لگا۔ جانے صبح کی چڑیوں نے اس کے کان میں کیا کہا کہ وہ پھر سے زار و قطار رونے لگی۔ بن آواز کے آنسو، بن ماں کے بچوں

کی طرح چپ چاپ...... آگے پیچھے گرتے چلے گئے۔

اس کی ساس چائے کی دو پیالیاں اٹھائے آ گئی تھی۔

چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ساس کو دیکھا تو ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

ساس نے ایک پیالی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی اور اپنی پیالی تپائی پر رکھ دی، پھر اسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھا لیا اور اس کی کمر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگیں جیسے اسے خاموشی کی زبان میں تلقین کر رہی ہوں۔

محبت کرو، محبت کرو......

راستہ دشوار تو ہے مگر منزل دور نہیں۔

ساس کے ہاتھوں میں ایک خاص بات تھی۔

یہی خاص بات اسے لے ڈوبی۔ پہلے دن ہی اس کا اپنی ساس کے ساتھ گہرا سمجھوتہ ہو گیا۔

ساس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا، مگر جانے اس نے کیسے سب کچھ سن لیا تھا۔

حالانکہ تھوڑی دیر پہلے وہ سوچ رہی تھی کہ ماں کو ایسے بیٹے کی شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ ماں چور ہے۔

ڈاکو ہے۔

گنہ گار ہے۔

مگر یہ ماں گنہ گار نہیں، اس کا دل کہے جا رہا تھا۔

جب آمنہ نے صبر کے گھونٹ کی طرح جرعہ جرعہ کر کے چائے پی لی تو ساس نے پیالی

اس کے ہاتھ سے لے لی اور بولی:

''چپ چاپ جا کے نیم گرم پانی سے نہالو- میں نے غسل خانے میں رکھ دیا ہے اور پھر سو جاؤ- میں تمہیں گیارہ بجے جگالوں گی-''

اس نے نظر بھر کے ساس کی صورت کو دیکھا- ان کے چہرے پر تردد ہی تردد تھا- نگاہ میں وسوسے تھے- اس گورے نورانی چہرے پر کرب کی اک لکیر آ کر ٹھہر گئی تھی--- جھریاں سہم گئی تھیں...... اور کمزور وجود شرمسار سا لگ رہا تھا- آمنہ آہستہ سے اٹھ کر آ گئی اور امی جان کے کہنے پر عمل کیا-

گھر مہمانوں سے بھرا تھا- ذرا دن ابھرتے ہی ولیمے کا شور اور ہنگامہ جاگ اٹھا- اس کے بعد ساس اور بہو میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور آمنہ ولیمے کا سبز جوڑا پہنے یوں سارا دن مقفل سی رہی جیسے وہ کوئی خاندانی سربستہ راز ہو-

کچھ دن اور اسے یونہی مقفل رہنا تھا اور حالات کا جائزہ لینا تھا- اپنے ڈوبتے ابھرتے جذبات کو عروسانہ روایتی شرم و حیا کے پردے میں چھپانا تھا-

کہ حیرت انگیز طور پر دوسری رات وہ سب ہو گیا جو کہ پہلی رات ہونا تھا- اگر پہلی رات ایک صدمے سے دوچار ہو کر گزری تھی تو دوسری رات بھی کچھ کم تعجب خیز نہ تھی-

جعفر نے آ کر بڑے پیار سے اس کے ہاتھ میں سہاگ کی نشانی کی ایک انگوٹھی ڈال دی اور پھر......

پھر کہا...... زندگی ازدواجی پٹڑی پر معمول کے مطابق چلنے لگی تھی، مگر ایک کانٹا سا آمنہ کے پہلو میں آ کر اٹک گیا- اس نے اپنے لبوں سے سی کی آواز تو نہ نکلنے دی تھی مگر اس کی پھانس کی کسک اکثر اپنے کلیجے میں محسوس کرتی تھی- دو ایک بار اس نے پہلی رات کی زیادتی کے بارے میں جعفر سے پوچھنے کی کوشش بھی کی، مگر جعفر ٹال گیا-

جعفر سے زیادہ اسے صغرا بی بی کا احترام تھا۔

صغرا بی بی کے دو ہی بیٹے تھے۔ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ دونوں بچوں کو اپنے پروں تلے پالا...... بڑا بیٹا ناصر ایک سرکاری ملازم تھا اور دوسرا بیٹا جعفر وکیل تھا۔ بڑے بیٹے نے دس سال پہلے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔ بیوہ کی اس بڑی حویلی کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک میں ناصر اور اس کی بیوی ستارا رہتے تھے اور دوسرے حصے میں صغرا بی بی اور جعفر میاں رہتے تھے۔

بیوگی کے بعد صغرا بی بی کی ساری زندگی عبادت اور تہجد میں گزری تھی۔ محلے کے لوگ انہیں پیر و مرشد کی طرح مانتے تھے۔ وہ ستائیسویں رجب سے جو روزے رکھنا شروع کرتیں تو شعبان، پھر رمضان روزے ہی رکھے چلے جاتیں۔ اس لیے محلے کے لوگ بچوں کو دم درود کرانے کے لیے ان کے پاس لایا کرتے، چھوٹے موٹے وظیفے پوچھنے کو چلے آتے اور نہیں تو گھریلو جھگڑوں سے بچنے کے لیے وعظ و نصیحت ہی سننے چلے آتے۔

جب ناصر نے ایک بدنام طبقے کی عورت کو گھر لانا چاہا تو صغرا بی بی کا تمام زہد و تقویٰ چیخ اٹھا۔ انہوں نے مقدور بھر مخالفت کی، سمجھایا، دھمکایا مگر عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ولی عہد گھر کا تاج و تخت تج دینے کے درپے تھا...... تو صغرا بی بی اپنی ممتا کا گلا گھونٹ کر اپنے ہاتھ سے اسے گھر میں لے آئیں۔ خودسر بچوں کے بے مہار جذبوں کے منہ پر والدین اپنے بناوٹی فیصلوں کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔

ستارہ بیگم گھر میں کیا آئی ---!

گھر میں بدزبانی، بداخلاقی اور بے حیائی اور سب کچھ اس سے ملتا جلتا آ گیا۔

ستارا کو معلوم تھا کہ ماں اس شادی کے حق میں نہ تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ سارا محلّہ ان کی مانتا ہے۔ اس لیے محلے کو سنانے کے لیے دن رات اونچی اونچی آواز میں بولا کرتی - ذرا

ذرا سی بات پہ مشتعل ہو اٹھتی۔ صغرابی بی کے سامنے ناصر کو ننگی ننگی گالیاں دیا کرتی۔ وہ چاہتی تھی کسی دن صغرابی بی زبان کھولے اور وہ سارے محلے کے سامنے ان کے مصلے کی دھجیاں بکھیر دے اور ان کی چوٹی پکڑ کر انہیں گھر سے باہر نکال دے۔

صغرابی بی نے چپ کا عارفانہ پیالہ پی لیا تھا۔ اس لیے آنکھوں سے دیکھتی اور کانوں سے سنتی رہ جاتیں۔

جلد ہی ناصر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا پاؤں موری کے کیچڑ میں جا پھنسا ہے۔ اب تن اور تن کے کپڑے کیوں کر صاف رہ سکتے تھے، جب کہ ستارا بیگم اس کے دو بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اب اپنا نہیں بچوں کا مستقبل اس کے پیش نظر تھا۔ اس لیے وہ ستارا اور بچوں کو اپنی ماں کے زیر سایہ رکھنا چاہتا تھا جب کہ ستارا جلد از جلد یہ گھر چھوڑ کر چلی جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنا گھر اپنی مرضی سے کسی اور محلے میں آباد کرنا چاہتی تھی، جہاں صرف اس کے جاننے والے اور اس کے چاہنے والے ہوں۔

لیکن ناصر ایک زخم کھا چکا تھا اور دوسرا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اسے یہ تو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ ستارا بدسلیقہ، پھوہڑ بدزبان اور بدلحاظ عورت ہے۔ صورت اور جوانی کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں ہے...... اور اپنی صورت اور جوانی پر وہ گھمنڈ بھی بہت کرتی تھی۔ جس عورت کو اپنی جوانی اور اپنی صورت پر ناز ہو، وہ اچھی ماں کیسے ہو سکتی ہے؟

ناصر نہیں چاہتا تھا کہ ستارا اس کی ماں سے الگ ہو۔ اس نے اپنی زندگی ایک فرشتہ صفت ماں کے ساتھ گزاری تھی اور اسے پتا چل گیا تھا کہ جنت اور جہنم میں کیا فرق ہے۔

شروع شروع میں تو ناصر پیار سے اپنی بیوی کو سمجھاتا رہا مگر جب اس کا ٹیڑھا پن نرمی سے دور نہ ہو سکا تو پھر سختی اور تشدد پر اتر آیا کہ بدزبان عورت کا یہی آخری علاج ہے۔

ان لڑائیوں کا رخ ستارا نے صغرابی بی کے طرف موڑ دیا۔ ہاتھ نچا نچا کر صغراں بی بی کو

گالیاں دیا کرتی اور محلے والوں کو سنا سنا کر کہتی کہ ''اس مکار بڑھیا نے میری زندگی اجیرن کر چھوڑی ہے-''

ان دنوں جب گھر جہنم کا نقشہ پیش کر رہا تھا اور محلے والے شور و شر کی آوازیں سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے، چھوٹا بیٹا جعفر وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کراچی گیا ہوا تھا-

کبھی کبھار جب وہ چھٹیوں میں آتا تو اسے اپنے گھر کی فضا بڑی عجیب لگتی- ایسے جیسے ہر شے توپ کے دہانے پر رکھی ہو- وہی ماں تھی- وہ ہی گھر تھا- وہی ماحول تھا، مگر جا بجا کانچ کے ٹکڑے بچھے ہوئے لگتے- ہر وقت یوں لگتا جیسے تلوے زخمی ہو جائیں گے یا ہتھیلیوں پر آبلے پڑ جائیں گے-

اور جب وہ بار بار گھر آنے لگا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں اتنا تناؤ کیوں ہے؟

ستارا کے ملنے جلنے والے پنچ اور آوارہ لوگ گھر میں بلا روک ٹوک آتے تھے- ستارا کے ٹھٹھے سارا محلّہ سنتا تھا- اس کی گالیوں سے کوئی کان محفوظ نہ تھا- بلا ناغہ میاں بیوی میں جوتم پیزار ہوتی تھی......

جس رات گھر میں جنگ ہوتی، اس سے اگلی صبح ستارا بن ٹھن کر گھومنے نکل جاتی- وہ رات گئے واپس آتی، کوئی مائی کا لال پوچھنے والا نہ تھا کہ وہ کہاں جاتی ہے؟ اور کیوں جاتی ہے؟

جعفر جوان تھا، باشعور تھا- حالات کا جائزہ لیتے ہی اس کا غیرت مند خون اچھلنے لگا-

ایک رات اپنی ماں کے پاؤں دابتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا:

''امی جان! اگر بھائی جان کی غیرت مر گئی ہے تو میں اس عورت کو ٹھیک کر دوں گا- میں اسے بتا دوں گا کہ شریفوں کے ساتھ رہنے کے طور طریقے کیا ہوتے ہیں-''

''نہیں۔ تم اپنی پڑھائی مکمل کرو۔'' امی نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''تم ان معاملوں میں نہ الجھو۔ شوہر جانے اور بیوی جانے۔''

''نہیں امی۔'' جعفر کا منہ سرخ ہو گیا۔ ''ہم نے بھی اسی محلے میں رہنا ہے اور سر اٹھا کر جینا ہے۔ دیکھئے میں اس عورت کا مزاج درست کر دوں گا۔''

''اپنا لب و لہجہ درست کر بیٹے۔ وہ تمہاری بھابی ہے۔''

''یہ تو ایک اتفاق ہے کہ وہ میری بھابی ہے۔ میری بہن بھی ہوتی تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔''

''بیٹا۔'' صغرا بی بی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''اس طرح باتیں نہ کرو۔ میرا جی ہولنے لگا ہے۔ برے کے ساتھ برا بننے کی کوشش نہیں کرتے۔''

''اور حد سے زیادہ اچھا بننے والوں کو بے غیرت اور بزدل کہتے ہیں۔''

''تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں؟''

صغرا بی بی چاہتی تھی کہ وہ جلدی سے چلا جائے۔

مگر وہ ان کی بات کا جواب دیئے بغیر اٹھ گیا۔

اتفاق سے باہر نکلتے ہی اس کا سامنا ستارا سے ہو گیا جو اس وقت بنی ٹھنی نخرے دکھاتی جانے کہاں سے چلی آ رہی تھی...... اس نے جعفر کی خون آلود نگاہ جب اپنے چہرے پر محسوس کی تو یوں اٹھلائی جیسے اس نے جعفر کی ہنسی اڑائی ہو۔ اور اس طرح مسکرائی...... جیسے اس نے جعفر کے منہ پر تھوکا ہو۔

جعفر کا خون کھول اٹھا۔ وہ مٹھیاں بھینچتا ہوا اس کے قریب سے نکل گیا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا، اس خوب صورت بلا کا گلا گھونٹ دے۔

وہ ایک خونی نگاہ۔

وہ ایک نفرت کی نگاہ ستارا بیگم کے لیے کھلا چیلنج بن گئی تھی۔

وہ خوب جان رہی تھی کہ جعفر اس سے کس حد تک نفرت کرتا ہے۔ کیسی...... نظروں سے اسے دیکھتا ہے اور اس کا انداز تخاطب کس قدر ہتک آمیز ہوتا ہے!

اول تو اس سے بات کرنے سے کتراتا ہے اور کبھی موقع مل جائے تو ہمیشہ یوں بات کرتا ہے جیسے اس کے مقابل انتہائی گھٹیا شے ہو۔

ایک دن جب ستارا بنی سنوری اکڑ دکھاتی کہیں جانے کو نکلی تھی، جعفر اس کے راستے میں آ گیا اور بولا:

‘‘کہاں جا رہی ہو؟’’

‘‘تم کون ہو پوچھنے والے؟’’ اس نے اپنا ہاتھ نچا کر کہا۔

‘‘میں ناصر کا چھوٹا بھائی ہوں۔’’

‘‘چھوٹے ہو تو چھوٹے بنے رہو، ورنہ ابھی تمہارا پتہ پانی کر دوں گی صاحبزادے۔’’

‘‘بھائی جان نے مجھے سب اختیارات دے رکھے ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ اس گھر میں سب لوگ بے غیرت ہیں۔’’ یہ کہہ کر جعفر نے راستہ چھوڑ دیا، مبادا اس کا ہاتھ اٹھ جائے یا کوئی اور بدمزگی ہو جائے۔

بس خرابی یہیں سے شروع ہوئی۔

جعفر نہیں جانتا تھا کہ نگاہ بد تاک میں کھڑی ہے، ورنہ وہ اتنا بڑا چیلنج نہ کرتا۔

وہ حقارت کی نگاہ جو اس نے ستارا پر ڈالی تھی، ستارا کے کلیجے کے پار اتر گئی۔ وہ ایسی عورت تھی، انتقام پر آئے تو بجلی بن کر خاکستر کر ڈالے۔

خوب جانتی تھی، مرد کی غیرت کو کیسے پھونکا جاتا ہے۔

جعفر کا ایک ہی تو شغل تھا۔ بڑا مجلس باز آدمی تھا۔ رات گئے دوستوں کی بیٹھک میں

بیٹھا رہتا۔ دنیا بھر کے موضوع زیر بحث رہتے۔ گھر میں ضعیف ماں تھی۔ بدزبان بھابی بھی اور ایک مسلسل نحوست۔ اس لیے وہ گھر سے دور دور رہا کرتا تھا۔ خصوصا رات کو بارہ ایک بجے گھر واپس آیا کرتا تھا۔

ایک رات جب صغرابی بی اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی اور جعفر رات کے دو بجے دوستوں کے ساتھ آخری شو دیکھنے کے بعد گنگناتا ہوا گھر میں داخل ہوا......

اعصاب پر رومانوی فلم کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ شام ڈھلے بارش ہوئی تھی اور ابھی تک سوندھی مٹی کی کنواری خوشبو سارے عالم میں پھیلی ہوئی تھی...... جی کے آس پاس جلترنگ سرج رہے تھے۔ کبھی کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ جوانی کا لوہا آپ ہی آپ تپ جاتا ہے۔ اس وقت کون چوٹ مارتا ہے' یہ نظر نہیں آتا۔ مگر لوہے پر چوٹ لگ جاتی ہے۔ جانے کیسے سارے گھر کی بتیاں چلی گئیں۔

اور جب وہ ٹٹولتا ہوا اپنے بستر کی سمت بڑھا تو دو نرم گداز' گرم گرم تجربہ کار ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔ ریشمی سرکتی ہوئی رات ان ہاتھوں پر آ کر رک گئی اور گپ چپ چور اندھیرا' تن من پر چھا گیا۔ نوجوان تھا' مگر شریف تھا۔ دریا میں تھا مگر خشک تھا...... قصے سن چھوڑے تھے۔ کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ بہت کچھ جانتا تھا مگر عمل کے میدان میں کورا تھا۔

اس کا کورا بدن بھر بھرا لاؤ دینے لگا۔

اس وقت وہ کڑکڑاتے سوکھے کاغذ کی طرح بن گیا جس کو ذرا سی آنچ پھونک ڈالتی ہے۔

آنکھ کھلی تو وہ نفس کا دریا پار کر چکا تھا۔

اسی وقت کمرے میں روشنی ہوگئی۔ ستارا بیگم قہقہے لگانے لگی اور جعفر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جانے کب وہ چھل پیری بی اس کے خرمن کو پھونکنے چلی آئی تھی۔

''تم وکیل ہو اور خوب جانتے ہو اس جرم کی سزا کیا ہے؟ اگر آج اسی وقت...... میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں تو تمہاری اور تمہارے بھائی کی کیا عزت رہ جائے گی اس شہر میں؟''

جعفر کا شرمسار سر جھک گیا۔

''تم نے اپنے بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تمہارے خاندان اور تمہاری مکار ماں کی بہتری اس میں ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو، آنکھیں بند رکھو اور میرے اشاروں پر چلتے رہو۔''

وہ چپ رہا۔

''اگر کسی دن بھی جوش جوانی میں الٹی سیدھی بکواس کی تو میں تمہیں پورے شہر میں ذلیل کر دوں گی۔''

وکالت پڑھنے والا، ماں کا پیارا پیارا بچہ، رات کو دیر تک بیٹھ کر ماں کے پاؤں دبنے والا کالی ڈائن کے منتر میں پھنس چکا تھا۔

یہ سب کیسے ہو گیا؟

یہ سب کیسے ہو گیا؟

اس کا رواں رواں ہتھوڑے برسانے لگا۔

ماں تو گھر سے کیوں چلی گئی۔ ماں، لوہے کا خود، آہن کی دیوار، دعاؤں کا سایہ، کیا دعاؤں کی دیوار میں بھی نقب لگ جاتے ہیں۔

ماں! مجھے پچھلے پہر کی کالی چڑیل نے لوٹ لیا ماں۔

صغرا بی بی کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ یکا یک جعفر کا رویہ ستارا کے ساتھ بدل کیوں گیا ہے؟ پہلے تو وہ جب صحن میں کھڑی ہو کر بولتی تھی تو وہ ابا کی پرانی زنگ آلود بندوق

اٹھا کر لے آتا تھا۔ اینٹ پتھر پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ لپک لپک کر باہر جاتا تھا اور ستارا کو چٹیا سے پکڑ کر نکالنے کے درپے تھا اور کہا کرتا تھا:

''بھائی جان بھی بے غیرت ہیں جو اس پنچ کے ساتھ گزارا کر رہے ہیں۔ میں ہوتا تو اب تک اس سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہوتا۔''

مگر اب جب ستارا اپنی واہی تباہی بکا کرتی، فحش کلامی کرتی، بچوں کو پٹخ پٹخ کر ناصر کو گالیاں بکا کرتی تو وہ اپنے بھائی جان کو پکڑ کر باہر لے جاتا۔ انہیں دست درازی کرنے سے باز رکھتا اور سارا قصور انہی کے سر تھوپ دیتا۔

صغرا بی بی حیران جعفر میاں کا مکھڑا تکتی رہ گئیں اور اس کی چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں، وہ کراچی سدھارا۔

دل میں تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ آئی بلا ٹل گئی ہے۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب وہ اپنے آپ کو سنبھال لے گا اور یہ ذرا سی لغزش یا بھول اس راستے کا پتھر نہیں بنے گی۔ اب پھر وہ اپنا رویہ سخت کر لے گا۔

مگر اگلی چھٹیوں میں جب وہ سب کچھ بھول بھال کر دوبارہ گھر آیا تو ستارا ایک راست موقع پا کر، سولہ سنگھار کیے یوں اس کے کمرے میں چلی آئی جیسے اس کی رکھیل ہو۔

''دیکھو بھابی......''

جعفر بل کھا کر یوں کھڑا ہو گیا، جیسے اس کے بستر پر سانپ چڑھ آیا ہو۔

''تم میرے بھائی کی عزت ہو۔ میرا تمہارا احترام کا رشتہ ہے۔

''اے گولی مار احترام کے رشتے کو...... عورت مرد کا صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے اور جب تم نے ایک بار احترام کی اس مصنوعی دیوار کو توڑ دیا تو اب کیوں دوسری جانب کھڑے ہو؟''

''پہلے بھی تم نے...... تم نے...... وہ نوخیز لڑکیوں کی طرح ہکلانے لگا۔

''تم نے میرے ساتھ زبردستی کی تھی۔''

ستارا یوں قہقہہ لگا کر ہنسی جیسے کوٹھے کی بالکنی پر کھڑی ہو اور پھر بولی:

''تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے تم نادان بچے تھے، کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ میں نے تمہیں ورغلایا تھا۔ اے آج کل کی کنواریاں اگر تمہاری باتیں سن لیں تو شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔ میں بھلا تمہاری رضامندی کے بغیر پیش قدمی کیسے کر سکتی تھی؟''

جعفر سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔

''خدا کے واسطے بھابی میرے کمرے سے چلی جاؤ۔''

''اے، دنیا کے سامنے بے شک بھابی کہہ لیا کرو، مگر میں اس گھر میں تمہاری معشوقہ بن کر رہنا چاہتی ہوں۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو بھابی۔ اپنے اوپر نہیں تو میرے اوپر ترس کھاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے اپنی نظروں میں اس طرح تو نہ گراؤ کہ میں مرد بن کر زندہ نہ رہ سکوں۔''

''کہاں چلی جاؤں، تم ہی بتاؤ۔ وہ زنخا جو مجھے بیاہ کر لایا، اس قابل نہیں کہ میں اس کی بیوی کہلاؤں۔ تم ہی بتا دو۔ کیا کوئی تیسرا ٹھکانہ ڈھونڈوں؟''

''بھابی......''

جعفر چیخا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شریف زادیاں اس قسم کی زبان استعمال کرتی ہیں۔

''ہاں، ہاں۔ اجازت دے دو۔ میرے باہر آنے جانے پر تمہی کو اعتراض ہے ورنہ تو اس شہر میں میرے اور بھی عاشق ہیں۔

اور جعفر بھی جانتا تھا۔ ستارا جیسی آوارہ لڑکیوں کو ہر جگہ عاشق مل جاتے ہیں۔ وہ جس طبقے سے آئی تھی، وہاں لڑکی کا جوان اور حسین ہونا بہت بڑی خوبی ہے۔

جعفر سوچ میں پڑ گیا۔

اس کو گردن لٹکائے دیکھ کر ستارہ شیر ہو گئی۔

"دیکھو جعفر سیدھے سیدھے میرے ساتھ سمجھوتہ کر لو، ورنہ چیخ چیخ کر دنیا کو بتا دوں گی کہ تم نے مجھے لوٹا ہے۔ یاد رکھو تمہاری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گی اور زہر کھا کر مر جائے گی اور تمہارا بھائی، تمہاری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ اور...... اور...... شہر والے جن کے آگے تم گردن اکڑا اکڑا کر چلتے ہو، تمہارے منہ پر تھوکیں گے۔"

جعفر جانتا تھا، قانون کی زبان میں اسے بلیک میل کرنا کہتے ہیں۔ وہ قانون کے اسرار و رموز بھی جانتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ پہلی لغزش کے بعد جان چھڑا لینا آسان ہے مگر......

وہ کالی جادوگرنی کے منتر میں اسیر ہوتا گیا۔ دلدل میں پاؤں رکھا تو اندر ہی اندر دھنستا چلا گیا۔ پہلے پہلے خوف کے مارے، مجبوری کے تحت...... پھر رفتہ رفتہ عادتاً۔

نشے کی لت، عادت کی لت سے جلدی پڑ جاتی ہے۔ "حی علی الصلوٰۃ" کی آواز اس طرح قدم نہیں پکڑتی جس طرح گھنگھرو کی آواز اور طبلے کی تھاپ پکڑ لیتی ہے۔

جعفر کو یوں دن دہاڑے جھکی جھکی نظروں سے صحن عبور کرتا دیکھ کر صغرا بی بی نے اپنے سینے پر صبر کی صلیب رکھ لی۔

صلیب کیوں نہ رکھتی۔ ایک دن لڑائی جھگڑے کے دوران ستارا بیگم نے ہاتھ نچا نچا کر صغرا بی بی سے کہا تھا:

"مکار بڑھیا۔ اپنے چھوٹے بیٹے پر فخر نہ کیا کر۔ بڑا تو قضا سے گیا ہے، چھوٹا رضا سے جائے گا۔ بڑے کا غم چھوڑ و اور اب چھوٹے کی جان کو رویا کر۔"

صغرا بی جی جان سے لرز گئی تھی۔

اس نے چھوٹے بیٹے پر دم درود بھی زیادہ کرنے شروع کر دیئے تھے۔

مگر آدم خور بلا، دم درود کے بیچوں بیچ اس کے بیٹے کی شاہ رگ کے قریب پہنچ گئی تھی۔

☆

صغرا بی بی کی زمانہ شناس نگاہیں جعفر کے لیے ایک مناسب دلہن ڈھونڈنے میں سرگرداں ہو گئیں...... جب کہ جعفر نے سرے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ وہ بچہ تھا جو ہمیشہ کہتا تھا:

''امی جان! میں آپ کی پسند سے شادی کروں گا۔ میری بیوی ایسی ڈھونڈ کر لائیے گا جو آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیے۔''

مگر اب وہ شادی کے نام سے بدکتا تھا۔

اور ستارا ببانگ دہل ہر ایک سے کہتی پھرتی تھی، وہ اس گھر میں جعفر کی بیوی کا وجود برداشت نہ کر سکے گی۔ جعفر میری اجازت کے بغیر شادی تو کر کے دیکھے۔

پھر بھی صغرا بی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ بالآخر انہیں آمنہ میں وہ سب کچھ نظر آیا جس کی وہ متلاشی تھیں۔ نیک والدین کی بیٹی تھی اور صغرا بی نے اس سے نیک امیدیں وابستہ کر لیں۔

ماں نے جب زبان دے دی تو جعفر مجبور ہو گیا۔ مسلسل انکار کا کوئی جواز بھی نہ پیش کر سکا۔

ستارا بھوکی شیرنی کی طرح اس کی اردگرد منڈلاتی پھر رہی تھی۔ بالآخر مہمانوں کی آنکھ بچا کر اس نے جعفر سے وعدہ لے لیا:

''کہ وہ پہلی رات اپنی دلہن کے ساتھ بے حسی اختیار کرے گا، ورنہ......'' ورنہ......

جعفر بزدل بن چکا تھا۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا۔

بعدازاں یہ بات آمنہ کو کسی طرح معلوم ہوگئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں وہ جان گئی تھی۔ یہ کہ...... بیڈروم میں جعفر سہما سہما سا کیوں رہتا ہے؟ کھل کر محبت تو کرتا، بات نہیں کرسکتا۔ تعلق وہ سا نہیں جیسا چاہنے والے میاں بیوی کا ہوتا ہے، بس...... جیسے وہ اپنا فرض نبھا رہا ہو۔

گھر والوں کو جو باتیں نظر نہیں آتیں، وہ دنیا والوں کو بڑی جلدی نظر آجاتی ہیں اور افواہوں کے بگولے بھی جلدی آمنہ کے کانوں تک پہنچ گئے۔

وہ اس ہرنی کی مانند بولائی بولائی پھرتی تھی جس کو جسم کے اندر زخم لگا ہو...... اور اپنی ٹیس دکھا نہ سکتی ہو۔

مگر جب تک آدمی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے، یقین نہیں کرتا۔ جانے کب تک وہ آس اور یاس کی سولی پر لٹکتی رہتی کہ ان آنکھوں نے بھی دیکھ لیا۔

ایک روز اچانک وہ میکے سے جلدی لوٹ آئی۔ صغرا بی گھر پر نہ تھیں۔ سیدھی اپنے بیڈروم میں آگئی۔

ستارا جعفر کے بستر پر یوں بیٹھی تھی جیسے کل کی بیاہی دلہن ہو۔ اس نے آمنہ کو دیکھا تو مٹکتی ہوئی اٹھی۔ لہرا کر دوپٹہ جعفر کے نیچے سے کھینچ نکالا، پھر آمنہ کی طرف حقارت سے دیکھ کر اس نے فرش پر تھوک دیا اور سینہ تانے یوں باہر نکل گئی جیسے اس نے آمنہ کے منہ پر جوتا رسید کردیا ہو۔ ہرچند کہ آمنہ نے بہت سی باتیں سن رکھی تھیں۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر آمادہ نہیں تھی۔

نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

کان اور آنکھیں بند رکھنا چاہتی تھی۔

کہ اس کی کوکھ میں ایک ننھا سا دل دھڑک رہا ہے۔

اس لمحے جب اس نے دیکھا، جعفر ڈھٹائی سے پڑا رہا اور ستارا اس پر تھوک کر چلی گئی تو اس کے اندر سوئی ہوئی عورت زخم خوردہ ناگن بن کر جاگ اٹھی۔

جعفر نے اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھا تو جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔

آمنہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اب اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ مزید اس گھر میں رہے۔ جب اپنا سامان باندھ کر آمنہ اچھی طرح رو چکی تو صغرا بی بی کمرے میں آ گئی۔

اس نے آمنہ کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھیں تو اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اب تک آمنہ، صغرا بی بی کو معاف کرتی آئی تھی مگر آج اس کا دل صغرا بی بی کی طرف سے بھی میلا ہو گیا تھا۔ منہ موڑے یوں بیٹھی رہی جیسے آج اسے کسی کی پروا نہ ہو۔

صغرا بی بی تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر اس نے آمنہ کے زانو پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور اپنی لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ بولی:

''تم جا رہی ہو، بہو۔ میں تمہیں جانے سے نہیں روک سکتی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتی۔ مگر بیٹی! عیار دشمن کے لیے محاذ خالی چھوڑ دیا جائے تو اسے جی بھر کر لوٹنے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں کمزور تھی۔ میرا محاذ کمزور تھا۔ جانے کب میں سوکھے درخت کی طرح گر جاؤں۔ میں نے یہ محاذ تمہارے سپرد کیا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس گرم خون ہے، اپنا حق چھین سکتی ہو۔ بدی کو نیکی میں بدل سکتی ہو۔ تمہارے پاس جوانی ہے، تدبر ہے، وقت ہے، زمانہ ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ ماں سے ماں ہونے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ بیوی کا اپنے شوہر پر اس کی ماں سے زیادہ حق ہوتا ہے۔ تم اس سے نہیں، اپنے حق سے منہ موڑ کر جا رہی ہو......''

آمنہ نے پلٹ کر دیکھا-

صغرا کا نورانی سا ہاتھ اس کی گود میں پڑا لرز رہا تھا-

یہ ہاتھ بھیک مانگ رہا تھا-

یہ ہاتھ جس نے پالنے میں بیٹے جھلائے‘ یہ ہاتھ التجا کر رہا تھا-

فریاد کر رہا تھا-

لرز رہا تھا-

آمنہ کی آنکھوں سے پھر نیر بہنے لگے- اس نے اپنے بندھے ہوئے سامان کی طرف دیکھا‘ پھر سر جھکا لیا-

یہ سر اٹھنے کے لیے جھکا تھا- اس لیے نوخیز و نوعمر آمنہ نے آگہی کا ایک اور پیالہ اور چپ کی چادر اوڑھ لی- رات گئے جعفر یوں اپنے کمرے میں داخل ہوا جیسے بلی پانی میں بھیگ کر اندر آتی ہے-

آمنہ سو نہیں رہی تھی مگر اس نے یہی تاثر دیا کہ وہ گہری نیند میں ہے-

اپنی بند پلکوں کے جھروکے ذرا ذرا سے وا کر کے وہ جعفر کا جائزہ لینے لگی- جعفر اس کے پلنگ پر لیٹنے کی بجائے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا-

جعفر اپنی ماں کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا- آمنہ کے پاس بیٹھ کر خوب پی لیتا تھا-

امی کمرے میں آ جائیں تو فوراً سگریٹ چھپا دیتا تھا-

آمنہ نے دیکھا‘ اس وقت وہ مسلسل کش لے رہا تھا اور بہت بجھا بجھا لگ رہا تھا-

اس کا چہرہ کسی عیاش آدمی کا چہرہ نہیں لگ رہا تھا- ایک مجبور آدمی کا پچھتاووں میں ڈوبا چہرہ تھا-

یکا یک آمنہ کا غصہ اور نفرت کہیں روپوش ہو گئی- اسے یوں محسوس ہوا‘ وہ نیکی کی اتنی

بڑی فصیل ہے کہ اس پورے خاندان کو بچا سکتی ہے۔

عورت پر عورت کا جادو نہیں چلتا۔

عورت ہی عورت کا توڑ ہوتی ہے۔

اس دنیا میں جتنے گھر برباد ہوئے، وہ بدقماش عورتوں کی وجہ سے ہوئے اور آباد گھروں میں بھی نیک عورتوں کی وجہ سے اجالا ہے۔

مرد کو کیا دوش دیں کہ عورت کے معاملے میں قدرت نے اس کے اندر ایک جھول رکھا ہے۔ اس جھول کو ہمیشہ نیک عورت پر کر دیتی ہے۔

عورت کو اس لیے نیکی، ٹھنڈک اور دل کا سرور کہا گیا ...... گھر کی رونق کہا گیا۔ مرد کی عاقبت کہا گیا۔

عورت کو مرد کی خطا، ماں کی طرح معاف کر دینی چاہیے۔

آمنہ...... آمنہ......

آمنہ کے اندر جیسے کوئی رونے لگا۔

اتنی بڑی تو کب سے ہوگئی؟

بات دراصل یہ ہے، اس نے دل میں سوچا، ایک فاحشہ اور بے غیرت عورت سے ہار مان لینا تو کوئی دانش مندی نہیں ...... ہر عورت ایسے میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

امی ٹھیک کہتی ہیں۔

اپنا حق، اپنی زمین، اپنی جگہ، اپنا آپ کیوں چھوڑا جائے۔ آج وہ میرا گھر برباد کر رہی ہے، کل کسی اور کا کرے گی۔

میرا دشمن جعفر نہیں، ستارا ہے اور مرد کبھی اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کرتا۔ مرد کو اپنا جھول نظر نہیں آتا۔ مرد اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا ہے۔ اس سے الجھنے سے فائدہ......؟

آمنہ نے کروٹ بدل لی اور جعفر کو جی بھر کر سوچنے کا موقع دیا۔ جانے کب جلتی کڑھتی وہ سو گئی۔

صبح اٹھی، جعفر کو ناشتہ کرایا۔ معمول کے مطابق سب کام کیے۔

دوسری رات جعفر کمرے میں آیا، تو بھی وہ چپ رہی۔

تیسری رات جعفر خود ہی پھٹ پڑا، آمنہ کو ہنسی آئی۔ مرد اپنی ذہنی اذیت کا بوجھ بھی زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتا۔

''جو کچھ کہنا ہے، کہتی کیوں نہیں ہو؟''

''میں نے کچھ بھی نہیں کہنا۔'' آمنہ نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر اتنے دنوں سے تھوتھنی کیوں پھلا رکھی ہے؟''

''میں نے تو نہیں پھلا رکھی۔''

''الو کی پٹھی......'' وہ ایک دم گرم ہوا۔ پھر اسے خود ہی شرم آئی کہ وہ کیوں آمنہ کو گالی دے رہا ہے۔ آمنہ نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔

اسی وقت آمنہ نے سوچا۔ اگر یہ سننا چاہتا ہے تو میں کیوں اب چپ رہوں۔

آواز کو اور آہستہ کر کے بولی:

''جعفر! میں تنگ دل عورت نہیں ہوں۔ میں نے اس گھر میں آتے ہی بہت کچھ سنا تھا۔ چاہتی تو تمہاری زندگی اجیرن کر سکتی تھی اور اب بھی...... لیکن ایسا ہے کہ میں سب دیکھا سنا معاف کر دوں گی، تم اب اس حرافہ سے قطع تعلق کر لو۔''

''اپنی حد میں رہو آمنہ......'' جرم کرنے کے باوجود جعفر کے اندر کا مرد غرایا۔

''یہ حد تو ہم دونوں کے لیے ہے جعفر......'' آمنہ نے بڑے سکون سے کہا۔ ''اور شرع و قانون نے بنائی ہے۔''

''تم مجھ سے زیادہ قانون اور شرع کو نہیں جانتیں۔''

اس نے پلٹ کر وار کیا۔

آمنہ سنبھل گئی۔ بات یوں نہ بنے گی۔

وہ قصور بھی ماننا چاہتا اور نہیں بھی ماننا چاہتا تھا۔

''جعفر......'' وہ بڑے پیار سے بولی۔ ''عام آدمی کا بلیک میل ہونا تو سمجھ میں آتا ہے' مگر...... کسی قانون دان سیانے آدمی کا۔''

'' بکواس مت کرو آمنہ......''

جعفر کھڑا ہو گیا اور چپل پہننے لگا۔

''یوں نہ جاؤ جعفر......'' آمنہ نے کھڑے ہو کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''میں پچھلے حساب نہیں مانگ رہی۔ میں نے بڑے ہی خلوص سے پیش کش کی ہے کہ آؤ نئے سرے سے نئی زندگی کی ابتدا کریں۔ جو کام تم نہیں کر سکتے' وہ میں کر سکتی ہوں۔''

جعفر نے اسے زور سے دھکا دے کر اپنا بازو چھڑایا۔ وہ دور پلنگ پر جا گری اور وہ باہر نکل گیا۔

............☆............

جعفر کے عدالت چلے جانے کے بعد آمنہ نکل کر برآمدے میں بیٹھ گئی۔ صغرا بی بی باورچی خانے میں نوکر کو سودا سلف لانے کے بارے میں سمجھا رہی تھی۔ اب آمنہ صغرا بی بی سے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ دونوں مل کر گھر کا سارا کام کر لیا کرتیں۔ آمنہ جعفر کے جانے کے بعد سایا بنی صغرا بی بی کے ساتھ رہا کرتی تھی...... آمنہ نے برآمدے میں بیٹھتے ہی ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

سامنے صحن میں آہٹ ہوئی تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ ستارا صحن سے گزری چلی جا رہی تھی۔

ستارا کے اب چار بچے تھے۔ اس نے اس وقت دوپٹہ نہیں اوڑھا ہوا تھا۔ اس کا جسم ایسا ہی تھا جیسا چار بچوں کی ماں کا ہوتا ہے، مگر وہ اپنے آپ کو خوب کس کسا کر رکھا کرتی تھی۔ رنگت گو ابھی تک گوری تھی مگر چہرے پر مہاسوں کے اتنے سیاہ نشان پڑ چکے تھے جو اس کے اعمال کی نشان دہی کو کافی تھے۔

مٹکتی ہوئی ستارا اپنے گھر سے نکلی تھی اور لہراتی ہوئی صحن کا چکر لگا کے، سینہ تانے، ادھر سے ادھر چلی گئی۔ جاتے جاتے آمنہ پر ایک حقارت آمیز طنزیہ نگاہ بھی ڈالتی گئی۔

آمنہ کے لیے صغرا بی بی جتنی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں تھی، ستارا اتنا ہی کڑوا نیم کا درخت تھی۔ اس گھر کا ہر فرد ستارا سے ڈرتا تھا اور تو اور جعفر بھی...... اس کا سامنا ہوتے ہی زرد ہو جاتا، اور کوشش کرتا کہ بیڈروم میں اس کا ذکر بھی نہ آنے پائے۔ ستارا گھر میں اس رشوت خور تھانیدار کی طرح رہتی تھی جو سارے محلے سے رقم بھی بٹورتا ہے اور سب کے کالے کرتوتوں سے واقف بھی رہتا ہے۔

……☆……

''بھائی صاحب! آپ کو معلوم ہے، اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟'' بہت دن تک سوچ سوچ کر آمنہ ایک دن موقع پا کر ناصر کے کمرے میں چلی گئی۔

ناصر اس کو دیکھ کر بوکھلایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

''میں تمہاری بات سمجھا نہیں بی بی۔''

''آپ اتنے معصوم نہیں ہیں کہ دس سال سے اس گھر کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور پھر بھی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ میں عورت ہوں اور مجھے اس گھر میں آئے چند ماہ ہوئے ہیں اور میں سب کچھ جان گئی ہوں۔ آپ کیسے مرد ہیں؟''

ناصر سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا۔

‘‘میں کیا کروں...... میں کیا کر سکتا ہوں؟’’

‘‘آپ بزدل ہیں اور معاف کیجیے گا، بے غیرت بھی ہیں۔’’ آمنہ نے غصے سے کہا۔ ‘‘آپ کا اپنا گھر تو آپ کی رضا سے برباد ہوا تھا، میرا گھر کیوں برباد کر رہے ہیں۔’’

‘‘میں سب جتن کر کے ہار گیا ہوں۔ وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔’’ ناصر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ‘‘تو پھر میں کیا کروں، اسے قتل کر دوں۔’’

‘‘بے غیرت کہلوانے سے قاتل کہلوانا زیادہ اچھا ہوتا ہے ناصر بھائی، لیکن شاید آپ نہیں جانتے، قتل آپ کر چکے ہیں۔ جب آپ ایک نیچ عورت کو بیاہ کر لائے تھے تو آپ نے اپنی ماں کو قتل کیا تھا۔ اپنے باپ کے وقار اور خاندانی ناموس کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا تھا۔ جب آپ نے اس عورت کو بے محابا آزادی دی تھی اور اس کے کرتوتوں پر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تو آپ نے اپنے اندر ایک شریف ماں کے بیٹے اور ایک غیور شوہر کو قتل کر دیا تھا۔

‘‘اتنے قتل کرنے کے باوجود اب آپ دہرے قتل کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔’’

‘‘میرا...... میرے بچوں کا...... میرے شوہر کا......’’

‘‘مگر یاد رکھیے، میں عورت ہوں اور میرے سامنے یہ بے غیرتی کا ناٹک زیادہ دیر تک نہیں کھیلا جائے گا۔ آپ اس وقت میرا ساتھ نہیں دیں گے تو مجھے کھل کر سامنے آنا پڑے گا۔ مجھے پھوڑے کا اندر ہی اندر بہنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے نشتر زنی میں ہی نجات نظر آتی ہے۔’’

‘‘بولیں، آپ میرا ساتھ دیں گے۔’’

ناصر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ گھٹی گھٹی آواز میں بولا:

‘‘بی بی! تم نے میری غیرت کو اس طرح للکارا ہے کہ آج زمین میں گڑ جانے کو دل چاہتا ہے۔’’

‘‘زمین میں گڑنے سے کسی کا بھلا نہ ہوگا۔ اس زمین کے اوپر رہنے کے لیے جگہ

بنائیے۔ آپ کو اپنے بچوں کے لیے‘ مجھے اپنے شوہر کے لیے زندہ رہنا ہے۔’’

‘‘تم ٹھیک کہتی ہو۔’’ وہ بولے۔ ‘‘میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ جو تم کہو گی‘ وہ کروں گا۔ اس صورت حال سے میں بھی تنگ آ چکا ہوں۔’’

‘‘مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ میں آپ کو منظر پر نہیں لاؤں گی‘ مگر توقع رکھوں گی کہ آپ میری سکیم میں شامل ہیں۔’’

جوں ہی وہ مڑی‘ ستارا سامنے آ گئی۔

خوب میک اپ کر کے جانے اس وقت اچانک کیسے ٹپک پڑی تھی۔

‘‘او ذلیل……’’ وہ ایک غرا کر بولی۔ ‘‘حرامزادی۔ میرے شوہر کے کمرے میں کیا کر رہی ہے؟’’

آمنہ رسان سے مسکرائی۔

‘‘وہی جو تو میرے شوہر کے کمرے میں کرنے جایا کرتی ہے۔’’

‘‘کمینی۔ کتی۔ تیری یہ مجال کہ میرے ساتھ اس طرح بولے۔’’

‘‘طوائفوں کے ساتھ اسی طرح بولا جاتا ہے۔’’

آمنہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔

‘‘زبان کو لگام دے ورنہ ابھی مزا چکھا دوں گی۔’’

‘‘بدکردار عورتیں کسی کو مزا نہیں چکھا سکتیں۔’’ آمنہ نے کہا۔ ‘‘ڈٹ کر میدان میں اترنا تو شریف عورت کا کام ہے۔’’

‘‘اچھا……’’ ستارا غرا کر بولی۔

‘‘آ لے تیرا شوہر‘ شام کو تجھے وہ جوتے لگواؤں گی کہ تو یاد رکھے گی۔ اپنے سامنے تیری چٹیا پکڑ کر اس گھر سے نکلواؤں گی۔’’

''میرا شوہر تیرا کیا لگتا ہے؟'' آمنہ بولی۔ ''اری جا بڑی دیکھی ہیں تیرے جیسی …… سستی عورتیں …… مرد کا کیا ہے، وہ تو طوائف کے پاس بھی جاتا ہے۔ دو ٹکے کی عورت کے پاس بھی جاتا ہے مگر پھر بیوی کے پاس واپس آ جاتا ہے۔ تیری حیثیت ایک جوتی کے برابر ہے۔ جب تک آرام دیتی ہے، پہن لی جاتی ہے، پھر اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دی جاتی ہے۔''

''واہ واہ……'' ستارا نے ہاتھ نچائے۔ ''آج تیری ایسی جرأت کہ تو اس گھر میں میرے سامنے منہ لگنے آئی۔ یہاں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ میرے معاملے میں بولے۔''

''میں تمہارے واہیات معاملوں میں بولنے نہیں آئی، اپنے معاملے میں بولنے آئی تھی۔''

''تو میرے شوہر کے کمرے میں کیوں آئی؟''

''یہی تو میں تجھ سے پوچھنے آئی تھی، بلکہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ تیرا شوہر کیسا ہے کہ تو اس کے ہوتے ہوئے دوسرے مردوں کو گرماتی پھرتی ہے۔''

بس اتنا سننا تھا کہ ستارا نے آگے بڑھ کر آمنہ کو دبوچ لیا۔ آمنہ اپنے بچاؤ میں چیخی چلائی …… تو صغرا بی بی چیخ و پکار سن کر ننگے پاؤں دوڑتی آئیں۔

ناصر نے آگے بڑھ کر آمنہ کو چھڑا لیا۔ آمنہ کے چہرے پر ستارا نے اتنے ناخن مارے تھے کہ لہو کی سرخ سرخ لکیریں اس کے آنسوؤں کو بھی لال کیے جا رہی تھیں۔

ہانپتی ہوئی آمنہ کو دور بٹھا کر ناصر لپک کر آیا اور اس نے ستارا کو دھنک کر رکھ دیا۔ آج اس کی غیرت بھی جاگ اٹھی تھی مگر صغرا بی بی بیچ میں آ گئی۔

وہ نہیں چاہتی تھی، گھر کا آنگن جنگ و جدل کا نقشہ بن جائے۔

بپھری ہوئی ستارا نے اپنے آپ کو ناصر کی گرفت سے چھڑایا اور لپک کر صغرا بی بی کو

دبوچ لیا۔

''بڈھی ڈائن۔ میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

مغضوب الغضب درندے کی مانند اس نے صغرابی بی کے گریبان کو پکڑ کر اس کے سر کو دیوار پر اتنی زور زور سے مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔

شام تک اس نے دم توڑ دیا۔

خون کچھ باہر بھی نکلا تھا' خون کچھ دل کے اندر بھی رہا تھا۔

ہارٹ فیل ہوا...... دماغ کی رگ پھٹ گئی...... یا شرم کے مارے اس نے پردہ کر لیا۔ وہ جو بھی مشہور کرتے' مناسب تھا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ صغرابی بی کو ستارا کے خونی پنجے نے چاٹ لیا تھا۔

کیا ہو گیا؟

اور کیا ہو گا؟

اس خیال سے ایک شب جعفر گھر سے نکل گیا۔ کہاں' کس طرف' کوئی نہیں جانتا تھا۔

باقی اس گھر میں کیا رہ گیا تھا جو آمنہ وہاں رہتی...... پھر زچگی کے دن بھی قریب آ رہے تھے۔ وہ اپنا سامان لے کر میکے آ گئی۔

اس نے تو اپنا حق چھیننا چاہا تھا' اس کو اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا۔

جب ننھی سی کلی اس کے پہلو سے ہوئی تو اس نے اسے گود میں لٹا کر بے تحاشا آنسو بہائے۔

پہلے بچے کا جنم خوشیوں کے خزانے لے کر آتا ہے۔ اس کی بیٹی پیدا ہوئی تو اسے معلوم بھی نہ تھا' اس کا باپ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیوں چھوڑ کر چلا گیا؟

بچی ایک سال کی ہوئی تو مشورہ دینے والے پالتو بلی کی طرح قریب آ کر بیٹھ گئے۔

جب شوہر لاپتا ہو جائے' جب کڑکڑاتی جوانی پچھلے پہر سونے نہ دے اور جب ایک ننھی معصوم جان بلک بلک کر روئے۔

تو پھر سب ایک ہی مشورہ دیتے ہیں۔

آمنہ نے کئی بار سوچا۔ اس نے اس شادی سے کیا پایا تھا؟ ایک بچی جو برسات کے اولوں کی طرح اس کی گود میں آ گری تھی۔ اسے تو سہاگ کی وہ رات بھی نصیب نہ ہوئی تھی جس کے لیے اس نے اپنی کوری جوانی کا دان دیا تھا' پھر وہ کس برتے پر انہونی بات کا انتظار کر رہی تھی۔

جب کوئی محبت کا مذاق اڑائے تو محبت بے معنی اور بھونڈی ہو کر رہ جاتی ہے۔

آمنہ نے بہت دن تک سوچ سوچ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ بی اے کے بعد اس کی شادی ہو گئی تھی۔ اب اپنی تعلیم مکمل کر کے وہ نوکری کرنا چاہتی تھی۔ نہ اس کے دل میں کوئی خواب تھا نہ ارمان...... ایسے جیسے پھولوں کی تلاش میں وہ کانٹوں کی نگری میں جا نکلی تھی اور انجانے میں تلوے لہولہان کر لیے تھے۔

انہی دنوں جب بچی کی بوتل کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کتابوں کو لیے بیٹھی رہا کرتی تھی' اسے ایک خط ملا:

اہو ٹھی!

آمنہ!

گناہوں کی تلافی بھاگ جانے سے نہیں ہوتی۔ اب جب میں نے ملازمت تلاش کر لی ہے' گھر لے لیا ہے' تنہائی میں اپنے آپ کو جی بھر کے ملامت کر لی ہے تو مجھے کفارہ ادا کرنے کی ایک ہی صورت نظر آئی ہے۔

تم نے اگر مجھے معاف کر دیا ہو تو بچی کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ اس طرح آنا کہ کسی

کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ساتھ کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں، حتیٰ کہ ماضی کی تلخ یادیں بھی وہیں چھوڑ دینا۔ ہم نئے ماحول میں نئے ساز و سامان کے ساتھ، نئے سرے سے اپنی زندگی کی ابتداء کریں گے اور اگر تم میں معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، صرف یہ ٹکٹ واپس بھیج دینا جو آج تمہارے نام رجسٹری کر رہا ہوں۔

خطا کار، جعفر

ستارا نے اپنی دانست میں آمنہ کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر جب اس نے سنا کہ آمنہ اپنے شوہر کے پاس چلی گئی ہے تو نئے سرے سے اس کے اندر بھونچال سے اٹھنے لگے۔ اب تو صغرا بی بی بھی نہیں تھیں جس پر وہ وقت بے وقت اپنا غصہ نکالا کرتی تھی۔ اس کی اذیت پسندی کو ہمیشہ کسی نہ کسی شخص کی ضرورت ہوتی تھی اور اب صرف ناصر رہ گیا تھا۔ سو وہ صبح و شام ناصر کے پیچھے پڑی رہتی۔ ناصر کیا کرتا۔ اس نے چپ کا روزہ رکھ لیا۔ ستارا جیسی عورت کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا...... ناصر کی بھی خاموشیوں نے ستارا کو اور دیوانہ کر دیا۔

ایک رات جب وہ حسب معمول اپنی زبان کی تیز تلوار چلا رہی تھی، ناصر نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔

جب اسے ناصر کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں تو اس پر غیض و غضب کا جن سوار ہو گیا۔

غصے سے بھری ہوئی اٹھی۔ باورچی خانے سے تیز چھری نکال کر لے آئی اور ناصر کے نرخرے پر پھیر دی۔ صابر شوہر دو منٹ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ یہی چھری جب وہ اپنے بچوں پر آزمانے لگی تو شور مچ گیا۔

پولیس آ گئی اور ستارا جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔

اس کے والدین رسوخ والے تھے۔ پیسہ کمانا جانتے تھے تو لٹانے کا ڈھنگ بھی آتا تھا مہینوں مقدمہ چلتا رہا۔ سب پرامید تھے کہ ستارا چھوٹ کر گھر آ جائے گی مگر کچھ فیصلے اللہ تعالیٰ خود کر ڈالتا ہے۔ ستارا جیل میں بھی ہذیانی انداز میں اونچے اونچے چلایا کرتی تھی۔ لوگوں کے سر پھاڑنے کو دوڑتی۔ ایک روز اس نے اپنا سر سلاخوں کے ساتھ دے مارا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔

ایک سال ہسپتال میں رہی، مگر اچھی ہونے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ایسی حالت ہو گئی کہ ہسپتال والوں نے عافیت اسی میں جانی کہ اسے ہسپتال سے رخصت کر دیں لیکن ایسی اولاد کو ماں باپ کتنے دن سنبھال سکتے ہیں؟

اب بھی شام نگر کے ایک گاؤں میں لوگ ایک پگلی کو دیکھتے ہیں۔ وہ سارا دن بالکل عریاں حالت میں کوچہ کوچہ گلی گلی پھرتی ہے۔ غیرت مند لوگ اسے پکڑ کر کپڑے پہنا دیتے ہیں، مگر وہ پھر اپنے لمبے ناخنوں اور غلیظ دانتوں سے کپڑوں کو تار تار کر دیتی ہے۔ اس کی شکل اتنی بھیانک ہو چکی ہے کہ دیکھنے والے کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ گلیوں کے بچے اس کی تواضع اینٹ پتھر سے کرتے ہیں۔

کوئی ترس کھا کے کھانا کھلا دیتا ہے، کوئی پانی پلا دیتا ہے ورنہ وہ سارا دن آوارہ گھومتی رہتی ہے اور سڑکوں سے غلاظت اٹھا اٹھا کر کھاتی رہتی ہے۔

ہاں یہ بات البتہ سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ پگلی شہر بھر میں کہیں بھی گھومتی ہے، رات کو ایک مزار پر آ کے پناہ لیتی ہے۔

پو پھٹتی ہے تو وہ بددعا کی طرح مزار کی آغوش سے نکلتی ہے اور شہر کی جانب رخ کرتی ہے اور جب رات سیاہ ہونے لگتی ہے تو بچھڑے بچے کی مانند مزار کی سمت لوٹ آتی ہے لوگ اس مزار کو ‘‘بڑی مائی’’ کا مزار کہتے ہیں اور سنا ہے بڑی مائی کا نام ‘‘صغراں بی بی’’ تھا